کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے

احمد صغیر

کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے

(دلت افسانے)

احمد صغیر

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔٦

KAHANI ABHI KHATAM NAHIN HUI HAI

(Dalit Short Stories)

by

Ahmad Sagheer

Years of Ist Edition 2015

ISBN 978-81-8223-448-2

Price Rs. 250/-

نام کتاب : کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے (دلتِ افسانے)

مصنف/ناشر : احمد صغیر

پتہ : حنیف منزل، کوئلی پوکھر، پولس لائن، گیوال بیگہہ، گیا-823001 (بہار)

موبائل نمبر : 09931421834, 08084808032

E-mail ID : ahmadsagheer52@yahoo.com

سنِ اشاعت اوّل : ۲۰۱۵ء

قیمت : ۲۵۰ روپے

کمپوزنگ : سید فضاالرحمٰن

سرورق : حسن رضا

مطبع : عفیف پرنٹرس، دہلی

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

انتساب

اپنے دادا

جناب عبداللطیف (مرحوم)

اور

دادی

محترمہ بی بی بولن اور بی بی مغلن (مرحومہ)

کے نام

ترتیب

❍ تعفن	9
❍ انّا کو آنے دو	15
❍ ڈوبتا ابھرتا ساحل	20
❍ پیاسی ہے زمیں، پیاسا آسماں	27
❍ فصیل شب میں جاگتا ہے کوئی	32
❍ پناہ گاہ	38
❍ شدھی کرن	46
❍ بے پناہ جنگل اور وجود	52
❍ سفر ابھی ختم نہیں ہوا	57
❍ آگ ابھی باقی ہے	62
❍ کاہے کو بیاہی بدیس	67
❍ میں دامنی نہیں ہوں	74
❍ اوور ٹائم	78
❍ کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے	84
احمد صغیر کے افسانے ناقدین کی نگاہ میں	87
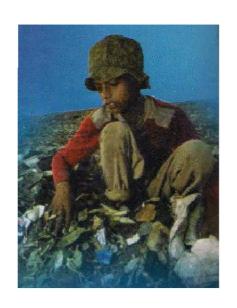
رات تو کسی طرح کٹی مگر صبح بھی کوئی چمار نہ آیا۔ چمارنی بھی رو پیٹ کر چلی گئی۔ بدبو پھیلنے لگی۔
پنڈت جی نے ایک رسّی نکالی اس کا پھندہ بنا کر مردے کے پیر میں ڈالا اور پھندے کو کھینچ کر کس دیا۔ ابھی کچھ کچھ اندھیرا تھا۔ پنڈت جی نے رسّی پکڑ کر لاش کو گھسیٹنا شروع کیا اور گھسیٹ کر گاؤں سے باہر لے گئے۔
وہاں سے آکر فوراً نہائے' درگا پاٹھ پڑھا اور سر میں گنگا جل چھڑکا۔
ادھر دکھی کی لاش کو کھیت میں گیدڑ' گدھ اور کوے نوچ رہے تھے۔ یھی اس کی تمام زندگی کی بھکتی' خدمت اور اعتقاد کا انعام تھا۔

(افسانہ "نجات" پریم چند)

تعفن

دھوپ میں لت پت تھکا دن، چاکلیٹی شام کی گود میں سر رکھ کر گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ فضا پر دھندلکا طاری ہو رہا تھا اور شہر بھر کے گندے محلے کے سڑتے ہوئے کوڑے کے ڈھیر سے دماغ تک کو گھٹن میں مبتلا کر دینے والے تعفن کا بھبھکا شام کی سرد ہوا کے ساتھ دور دور تک پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ یوں تو دن بھر اس کوڑے سے تعفن کے جھونکے اٹھتے رہتے تھے لیکن شام ہوتے ہوتے اس کی بدبو میں مزید اضافہ ہو جاتا مگر مُنوا کی زندگی میں ان بدبوؤں کے سونگھتے رہنے اور کچرا بیننے کے سوا اور کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ شام ہوتے ہوتے اس کا بوسیدہ بورا کچرے سے بھر جاتا۔ گندی بوتلیں، استعمال شدہ پولوتھین، ٹین کے ڈبے، شیشے کے ٹکڑے اور مختلف بظاہر بے کار چیزوں سے اس کا بورا بھاری نظر آنے لگتا۔ تب وہ سیدھا کباڑی کی دُکان پر پہنچتا۔ اُسے فروخت کرتا اور پیسے لے کر گھر کی طرف چل پڑتا۔ ماں اس کے انتظار میں بیٹھی رہتی کہ کب وہ پیسہ لے کر آئے کہ چولھا گرم ہو۔ منوا بورا کو ایک طرف ڈال کر بنیئے کی دُکان پر پہنچ جاتا، آدھا کیلو آٹا، سو گرام دال، ۵۰ گرام تیل، نمک، مرچ اور ہلدی لا کر ماں کو پکڑا دیتا۔ ٹی۔ بی زدہ ماں دن بھر چن کر لائی ہوئی لکڑیوں سے چولھا گرم کرتی اور توا اس پر ڈال دیتی۔ منوا باہر کے ہینڈ پمپ پر ہاتھ منہ دھونے کے لیے چلا جاتا۔ واپس آ کر اسی بوسیدہ بورے کو بچھا کر بیٹھ جاتا جس میں سامان بین کر کے رکھتا تھا—'

مُنوا کا باپ رکشہ چلاتا تھا اور اپنی کمائی کا آدھا حصہ شراب میں صرف کرتا تھا۔ آدھے پیسے سے پھُلوا کی دوا آتی یا جھونپڑی کا کرایہ ادا ہوتا تھا۔ لالٹین کی مدھم لرزتی ہوئی روشنی میں پھُلوا آدھا کچا آدھا پکا کھانا منوا کو پروس دیتی۔ وہ جلدی جلدی کھانے کو حلق سے نیچے اُتارتا اور اسی بورے پر اپنا تھکا ہوا جسم پھیلا دیتا۔ باپ آدھی رات کو شراب کے نشے میں دُھت، کبھی کبھی سڑی گلی مچھلیاں بازار سے لے کر آتا، انہیں تلنے کے لیے کہتا۔ پھلوا بے دلی سے جیسے تیسے تل کر اسے دیتی۔ وہ کھاتا اور ڈھیر ہو جاتا کبھی دیر رات تک گانا گاتا رہتا، کبھی شور شرابہ کرتا—'

رات رفتہ رفتہ خاموشیوں کی گود میں آنکھیں بند کر لیتی۔ منوا کی زندگی میں دکھ، دریا کی طرح رواں دواں تھا اور وہ ڈوبتی کشتی کی مانند ہچکولے لیتا رہتا تھا۔ پھر بھی وہ رات بھر خوبصورت اُڑن طشتری میں بیٹھ کر خوابوں کی دنیا میں سیر کو نکل جاتا... سنہرے خواب اس کے اردگرد منڈلاتے رہتے... وہ خوابوں میں کبھی ہنستا، کبھی مسکراتا اور کبھی کبھی رو بھی پڑتا—'

منوا کے شب و روز میں کوئی ایسا لمحہ نہیں تھا جسے کوئی خوبصورت نام دیا جا سکتا۔ اس کا روزانہ کا معمول تھا کہ صبح سویرے اٹھتا، منہ ہاتھ

دھو کر یا بغیر منہ دھوئے اپنا بوسیدہ بورا لے کر سامان بیننے کے لیے نکل جاتا۔ راستے میں اُسے کبھی کبھی کوئی ہینڈ بل، پرانا اخبار یا اس کا ٹکڑا ملتا وہ اسے اٹھا کر کسی جگہ بیٹھ جاتا۔ اُس میں چھپی تصویروں کو غور سے دیکھتا اور اس میں چھپے حروف کو پڑھنے کی ناکام کوشش کرتا—— کبھی کبھی وہ سفید کاغذ اٹھا کر اس پر ایک دائرہ بناتا۔ دائرے کے درمیان کچھ لکھتا مگر تحریر پڑھی نہیں جاسکتی تھی۔ شاید اس کی انگلیوں کی حرکت کوئی نشان بناتی—— پھر اس کاغذ کو موڑ کر اپنی جیب میں ڈال لیتا۔ ٹوٹے قلم کو جیب میں کھونستا اور اپنے کام میں لگ جاتا——'

جب تک وہ کچرے کے ڈھیر پر رہتا اور سامان بینتا، اُس کچرے کے ڈھیر سے اٹھنے والا تعفن اس کے نتھنوں سے ہوتا ہوا اس کے احساس میں پیوست ہوتا رہتا۔ وہ بدبو اس کے دماغ میں بالکل بس گئی تھی۔ وہ بدبو کا اس قدر عادی ہو گیا تھا کہ ایک کچرے کے ڈھیر سے ہٹ کر دوسرے کچرے کے ڈھیر تک پہنچنے کے درمیان جو لمحے آتے وہ لمحے اس کے لیے بے کیف اور سیٹھے ہوتے۔ اس کی کوشش یہی ہوتی کہ زیادہ سے زیادہ دیر تک وہ کچرے کے پاس ہی رہے تا کہ تعفن کا وجود اس کی تنہائی کا ساتھی بنا رہے اور وہ زیادہ سے زیادہ سامان بھی بین سکے——'

منوا اب سامان کی تلاش میں شہر کے ایک نو آباد علاقے میں بھی جانے لگا تھا۔ اُدھر ابھی دوسرے لڑکے اپنے تھیلوں کے ساتھ نہیں پہنچے تھے۔ یہ علاقہ عام شہری حدود سے ذرا الگ تھلگ تھا اور اس کالونی سے بس تھوڑی ہی دور پر کچرے کا ایک بڑا سا ٹیلہ کھڑا ہو گیا تھا جس مقام پر کچرا ڈالا جاتا تھا اس کے پاس ہی ایک بڑا سا نالا بھی بہتا تھا۔ نالے کی دوسری طرف پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر ایک مکان تھا۔ یہ نیا نیا تعمیر ہوا تھا۔ اس میں سمیر ملکانی اور مسز ملکانی رہتے تھے۔ سمیر ملکانی کسی کمپنی میں بڑے عہدے پر فائز تھے، کمپنی نے ایک کار بھی دے رکھی تھی۔ مسز ملکانی کی کوئی خاص مشغولیت نہیں تھی۔ اس لیے ان کا زیادہ تر وقت گھر پر ہی گزرتا۔ آس پاس کے دوسرے مکان ابھی زیر تعمیر تھے، اس لیے پاس پڑوس میں ملنے جلنے والے بھی نہیں تھے——'

مسز ملکانی روز منوا کو سامان بینتے دیکھتی۔ اُسے بہت افسوس ہوتا کہ غربت نے اس بچے کو کہاں لا کر پھینکا ہے۔ اس کی عمر ابھی پڑھنے لکھنے کی تھی لیکن قسمت نے ہاتھوں میں بورا پکڑا دیا ہے۔ منوا پر مسز ملکانی کو بہت ترس آتا۔ ملکانی کی شادی کو کئی سال ہو گئے تھے مگر ابھی تک اس کی گود خالی تھی شاید اس لیے بھی اس کی نگاہیں منوا کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی رہتیں۔

منوا کو ذرا بھی احساس نہیں ہو سکا تھا کہ کسی کی نظریں اس کا طواف کرتی رہتی ہیں۔ ایک دن اچانک اس کی نظر اس گھر کی طرف اٹھ گئی تو اس نے محسوس کیا کہ ایک عورت مسلسل اُسے ہی گھورے جا رہی ہے۔ پھر اس عورت نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے بلایا۔ پہلے تو منوا ادھر اُدھر دیکھنے لگا کہ شاید کسی اور کو بلا رہی ہے لیکن جب مسز ملکانی نے اس کی طرف اشارہ کیا تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف چل پڑا۔ سامان سے بھرا بورا باہر ہی چھوڑ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ مسز ملکانی پہلے ہی دروازہ کھول کر کھڑی تھیں۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''مُنوا۔''

''کہاں رہتے ہو؟''

''پشتہ پر— جمنا کے پاس جو ہے۔''

''کھانا کھایا ہے؟''

منوا نے ''نا'' میں سر ہلایا۔

''یہیں ٹھہرو، ابھی لے کر آتی ہوں۔''

مسز ملکانی اندر گئیں اور ایک اخبار میں چند روٹیاں اور سبزی لے کر آ گئیں۔ منوا کھانا لے کر دور ہٹ گیا۔ مسز ملکانی اُسے دیکھتی رہیں۔ منوا نے بھی مڑ کر ایک بار مسز ملکانی کو غور سے دیکھا۔ پھر ایک جگہ بیٹھ کر روٹی کھانے لگا—'

یہ کوئی نیا واقعہ نہیں تھا۔ وقتاً فوقتاً رحم دل عورتیں اس کی غریبی پر ترس کھا کر اُسے کھانا کھلا دیتی تھیں لیکن یہاں یہ معمول میں داخل ہوتا چلا گیا۔ مسز ملکانی روزانہ اُسے بلا کر کھانا دینے لگیں۔ کبھی کبھی وہ منوا کے پہنچنے سے پہلے ہی کھڑکی کھولے کھڑی رہتیں اور جب منوا آتا تو اُسے کھانا دے کر جیسے انہیں اطمینان ہو جاتا—'

رفتہ رفتہ اس معمول میں ایک تبدیلی یہ بھی آئی کہ اب اخبار میں کھانا دینے کے بجائے پلیٹ میں دینے لگی تھیں اور اُسے وہیں اپنی آنکھوں کے سامنے کھانے کو کہتیں۔ پھر پانی کی ایک بوتل بھی لا کر دیتیں۔ اب کھانا بھی بہتر اور تازہ ہوتا جو گھر میں پکتا وہ منوا کو بھی مل جاتا یا یہ کہئے کہ منوا کے حصے کا بھی کھانا پکنے لگا تھا۔

منوا کی زندگی میں ایک جگنو چمکا تھا۔ سالہا سال سے اس کی زندگی جو ایک ڈگر پر رینگ رہی تھی۔ اُس میں تھوڑی تر و تازگی آ گئی تھی— چند حسین لمحے اس میں شامل ہو گئے تھے... اندھیروں کی یورش سے نبرد آزما رہنے والا منوا اب خود کو اجالے کا ایک حصہ تصور کرنے لگا تھا مگر... مگر وہ اس روشنی کو خود کو کھپا نہیں پا رہا تھا کہ وہ جس زندگی کا عادی تھا وہ اُسی میں جینا چاہتا تھا۔ نرم و نازک اور لطیف جذبوں کو اُس نے کبھی محسوس ہی نہیں کیا تھا۔ اس نے باپ کی جھڑکیاں سنی تھیں۔ اس کی لات کھائی تھی۔ ماں کی گالیاں بھی اُسے برداشت کرنی پڑتی تھیں۔ محبت کے گیت سے اس کے کان بالکل نا آشنا تھے۔ اتنی معصوم بھولی بھالی صورت اس نے اپنی ماں کی بھی کبھی نہیں دیکھی تھی—'

منوا اکثر سوچتا— اس عورت سے کیا رشتہ ہے میرا—'

یہ عورت مجھ پر اس قدر مہربان کیوں ہے؟— اس دنیا میں مجھ جیسے چہرے تو بہت سے ہوں گے لیکن مجھ جیسوں کے لیے تو سب بیگانے ہیں۔ سب انجانے ہیں۔ چہروں کے اس جھرمٹ میں اس عورت کا چہرہ منوا کے ذہن کے آئینہ خانے میں رفتہ رفتہ اپنا عکس بناتا جا رہا تھا— خوابوں کے سانچوں میں ڈھل کر کئی رنگ کئی روپ بدل کر اسے گھیرے میں لیے جا رہا تھا— وہ حیران تھا...'

کیا نام ہے اس رشتے کا— بس بے نام سا ایک رشتہ— وہ بے نام سا رشتہ اور اس عورت کا چہرہ یاد آتے ہی اس کے اندر تازگی آ جاتی— اور منوا سرشاری کے عالم میں اس عورت کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کے سحر میں کھو جاتا— وہ عورت کتنی شفیق ہے— اُسے روز کھانا کھلاتی ہے— شفقت سے پیش آتی ہے— اُسے محبت بھری نظروں سے دیکھتی ہے— جب تک وہ کھانا ختم نہیں کر لیتا اُسے نہارتی رہتی ہے اور جب کھانے سے فارغ ہو جاتا ہے تو پھر اطمینان کی سانس لیتی ہے—'

''اور کچھ چاہیے؟''— مسز ملکانی محبت بھری نظروں سے سوال کرتیں۔ منوا نفی میں سر ہلا دیتا۔ پھر بھی مسز ملکانی اس کی ہتھیلی پر دس کا ایک نوٹ رکھ دیتیں—

''راستے میں تمہیں جو چیز پسند آئے خرید کر کھا لینا''—

منوا کبھی ہتھیلی میں پڑے نوٹ کو دیکھتا اور کبھی مسز ملکانی کو— پھر وہ اٹھتا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا گھر کی جانب بڑھتا۔ جب تک وہ مسز ملکانی کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو جاتا۔ وہ اسے دیکھتی رہتیں۔

زندگی صبح سے شام تک دوڑاتی ہے... پھر رات آتی ہے... اور راتوں کو خوابوں کے سمندر میں غوطہ کھلاتی ہے— منوا کو ایسا لگتا جیسے وہ طوفان کی زد میں ہے اور اس کا وجود اس طوفان کے حصار میں پھنس گیا ہے۔ وہ ہاتھ پیر مار کر طوفان سے بچنا چاہتا ہے لیکن لاحاصل۔ اب اس کے اختیار میں کچھ نہیں ہے— اچانک اس کی آنکھ کھل جاتی ہے—

اب وہ سنہرے خوابوں کی جگہ مسز ملکانی کو دیکھنے لگا تھا۔ جو دھیرے دھیرے ممتا کے حصار میں اُسے قید کرتی جارہی تھیں اور وہ ان کی محبت کے سحر میں ڈوبتا جارہا تھا۔ وہ سوچتا— مسز ملکانی کے ساتھ گزارے ہوئے پل بس خواب ہی تو ہیں... فقط چند دنوں کا تماشہ جسے ایک دن ختم ہو جانا ہے—'

وہ محسوس کرتا کہ مسز ملکانی کو دیکھ کر وہ کمزور پڑ جاتا ہے، اس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے... کیا اسے لذیذ کھانا کھینچ کر لے جاتا ہے یا دس روپیہ یا پھر کوئی اور شے— حالانکہ اُسے یہ سب بالکل اچھا نہیں لگتا۔ وہ ہر روز یہ سوچ کر گھر سے نکلتا کہ آج مسز ملکانی سے وہ انکار کردے گا لیکن اس پر نظر پڑتے ہی وہ سب کچھ بھول جاتا۔ وقت کی بوند میں جذب ہوتی آواز اس کے پیروں کی زنجیر بن جاتی۔ پھر اس وقت اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا جیسے وہ کوئی جادوگرنی ہو جس نے اپنے جادو سے منوا کو اپنے بس میں کر لیا ہو اور وہ اس کی طرف کھنچتا چلا جارہا ہو...

منوا کے معمول میں جو تبدیلی آئی تھی اُسے ذرا بھی نہ سہاتا... وہ اپنی اصل حالت میں ہی جینا چاہتا تھا مگر نہ جانے کیا تھا کہ وہ بے بس ہو کر مسز ملکانی کے ایک اشارے پر اس کے پاس پہنچ جاتا— لیکن یہ قربت چند ساعتوں کی ہوتی۔ منوا کے جانے کے بعد مسز ملکانی کو پھر سے تنہائی کا ناگ ڈسنے لگتا۔ ہر طرف ایک سکوت طاری ہو جاتا۔ خاموشیاں سسکیاں بھرنے لگتیں اور ایسے گزرتے لمحوں کی بے اماں وسعتوں میں وہ اپنے وجود کو بے یار و مددگار محسوس کرتی... وقت تو بہتا ہوا دھارا ہے... بہتا جائے گا... وقت یوں ہی لمحہ، سال وصدی میں تبدیل ہو رہا ہے لیکن وقت کے بہتے ہوئے تیز دھارے میں کہیں وہ گم ہوگئی تو؟... اور تب منوا اس کے حواس پر پوری طرح چھا جاتا۔ کاش منوا میرے ساتھ رہ جاتا تو اسے خوب پیار کرتی... اُسے اچھے اچھے کپڑے پہناتی اور کسی اچھے اسکول میں داخلہ کروا دیتی...

آخر ایک دن مسز ملکانی نے ایک فیصلہ کر ہی لیا۔ اس دن اس نے منوا کو گھر کے اندر بلایا۔ اُسے غسل خانہ میں لے گئی اور شاور کھول کر نہانے کے لیے کہہ کر باہر چلی آئی۔ منوا اچھی طرح نہا کر جب باہر نکلا تو اس کا رنگ نکھر آیا تھا۔ مسز ملکانی اسے اپنے بیڈروم میں لے گئی اور نیا سلا ہوا کپڑا اُسے پہننے کو دیا۔ منوا کو عجیب سا لگ رہا تھا۔ یہ عورت کیا کر رہی ہے— کپڑے پہنانے کے بعد اس کے بال سنوارتی ہے اور

ڈھیر سارا پرفیوم اس کے کپڑے پر چھڑک دیتی ہے۔ چاروں طرف تیز خوشبو چکرانے لگتی ہے۔ منوا کو اس خوشبو میں عجیب سی گھٹن کا احساس ہوتا ہے۔ ان سب چیزوں کا وہ قطعی عادی نہیں تھا۔ وہ اس ماحول اور ان سب چیزوں کی لذت سے بالکل ناآشنا تھا۔ اس کی ناک میں تو کیچڑے کی سڑانڈ بسی ہوئی تھی۔ اس کے دل و دماغ میں ایک حبس کا عالم طاری ہونے لگتا ہے، ایک ہیجانی کیفیت سے وہ دوچار ہونے لگتا ہے۔ خود کو معمول پر لانے کے لیے اسی سڑانڈ کی طرف بھاگنا چاہتا تھا لیکن مسز ملکانی اس کا راستہ روک کر اسے ڈائننگ ٹیبل پر بٹھا دیتی ہیں۔ آج ملکانی نے اس کے لیے بہت ہی لذیذ کھانے خاص طور پر تیار کئے تھے۔ منوا ایک نظر پکوان پر ڈالتا تو ایک نظر مسز ملکانی پر اور کبھی خود کو دیکھنے لگتا۔ قاب اور پیالوں سے، خود اس کے کپڑوں سے، ملکانی کے لباس سے یہاں تک کہ آس پاس کی فضا سے بس خوشبو ہی خوشبو چاروں طرف پھیل رہی تھی جس نے منوا کو پسینہ پسینہ کر دیا تھا۔ اس کے پیٹ میں سانس نہیں سما رہی تھی اور بالآخر مسز ملکانی نے جیسے ہی اسے خود اپنے ہاتھوں سے کھلانا چاہا۔ وہ چکرا کر کرسی سے نیچے گر گیا اور بے ہوش ہو گیا ——!

●●
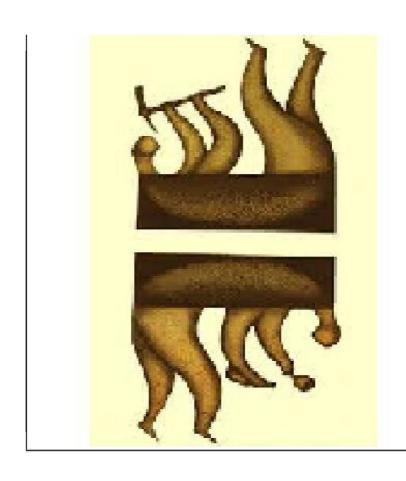
بازار میں پہنچ کر گھیسو بولا—"لکڑی تو اسے جلانے بھر تو مل گئی ہے کیوں مادھو؟

مادھو بولا—"ھاں لکڑی تو بہت ہے۔ اب کپھن چاھئے۔"

"تو کوئی ھلکا سا کپھن لے لیں۔"

"ھاں اور کیا۔ لاش اٹھتے اٹھتے رات ہو جائے گی۔ رات کو کپھن کون دیکھتا ہے۔"

""کیسا برا رواج ہے کہ جسے جیتے جی ڈھانکنے کو چتھڑا بھی نہ ملے۔ اسے مرنے پرنیا کپھن چاھئے۔"

""کپھن لاش کے ساتھ جل ھی تو جاتا ہے۔"

"اور کیا رکھا ہے۔ یھی پانچ روپیہ ملتے تو کچھ دوا دارو کرتے۔"

(افسانہ ""کفن" پریم چند)

انّا کو آنے دو

سارا گاؤں دہشت گردوں کا نشانہ بن چکا تھا——————'

آہستہ آہستہ گھروں سے اُٹھتے شعلے اب دھواں بن چکے تھے۔گلیاں ویران تھیں' لوگ اپنے اپنے گھروں میں یوں چھپے بیٹھے تھے جیسے مرغیاں دربوں میں دبکی رہتی ہیں۔آسمان کا کنارہ تک سیاہ مائل ہو چکا تھا اور ہر طرف خاموشی کی طویل چادر بچھی ہوئی تھی۔پولس جیپ کی گڑگڑاہٹ' سائرن اور سرچ لائٹ کی روشنی سے چند لمحوں میں سارا گاؤں روشن ہو گیا۔پولس' گواہی اور ثبوت اکٹھا کرنے لگ گئی اور ایک بار پھر اَدھ جلے گھروں سے رونے اور چیخ و پکار کی صدائیں بلند ہونے لگیں——————'

بولنا سب ہی چاہتے تھے مگر خاموشی کی کیلیں سب کے ہونٹوں میں جیسے پیوست کر دی گئی تھیں۔کتنے ہی نازک پھول مرجھا گئے تھے یا شاخ سے ٹوٹ کر بکھر گئے تھے' کتنوں کا تو آشیانہ ہی اُجڑ گیا تھا نہ پردہ' نہ رسّی' نہ طنابیں........کھلے آسمان کے نیچے کتنے ہی لوگ آ چکے تھے——————'

پھُلمتیا کے ذہن میں بہت سارے سوالات گونجتے رہے۔وہ کھاٹ پر چپ لیٹی تھی۔پھول سی اَدھ جلی بچی اُس کے بغل میں سوئی تھی جس کے زخم پر چند گھنٹہ قبل مرہم لگایا گیا تھا—————— کبھی کبھی پھُلمتیا کو محسوس ہوتا کہ واقعی جینا بہت مشکل ہے۔ایک ہی رات میں کیا سے کیا ہو گیا؟——————

لیکن یہ کوئی ایک دن کا واقعہ تو تھا نہیں——————؟

——————پھُلمتیا جلے ہوئے مکان کی طرف دیکھتی ہے۔اُس پر کوئی تصویر موجود نہیں۔تمام تصویریں خاکستر ہو چکی تھیں۔فقط اُن کے نقوش باقی تھے۔بنّا' رمنوا' دُکھیا' ہریا اور سُمنیا' گھر کے کتنے ہی افراد مارے گئے تھے اور یہ صرف ایک گھر کی بات نہیں تھی۔کتنے ہی گھروں کے افراد ہلاک ہوئے تھے۔پھُلمتیا تو گن بھی نہیں پائی تھی۔کہتے ہیں پولس نے بہت سی لاشیں ہی غائب کر دیں۔'

اُس نے دیکھا دم کٹا کتا پھر بھونک رہا تھا' ایک ہفتہ سے لگاتار وہ بھونک رہا تھا' اب اور کون سا حادثہ باقی ہے؟——————اُس نے سوچا۔اب وہ اکیلی تھی ایک دم اکیلی۔چاروں طرف اندھیرا تھا۔اور اُس پھیلے اندھیرے کا وہ ایک حصہ بنی ہوئی تھی۔دل دھڑک رہا تھا' دھڑکے جا رہا تھا۔ابھی تک خوف سے اُس کا بدن کانپ رہا تھا' کہیں اندھیرے میں وہ راستہ نہ بھول جائے——————؟

اس گاؤں سے اُٹھتی آگ کی لپٹوں کو آس پاس کے گاؤں والوں نے بھی دیکھا مگر ایک انجانی دہشت تھی کہ پورے علاقہ کے لوگوں کے دلوں کو دھڑکائے جا رہی تھی اور اس دہشت زدہ ماحول میں لوگوں کی نگاہیں خود بخود انّا کو تلاش کر رہی تھیں ـــــــــــ'

ـــــــــــ مگر اسے تو اقتدار کے ذخیرہ اندوزوں نے سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا تھا!

ـــــــــــ پھُلمتیا کو اچھی طرح یاد تھا کہ انّا کے آنے سے گاؤں والوں کی خود اعتمادی دھیرے دھیرے بڑھ رہی تھی وہ جہاں تہاں لوگوں کو جمع کر کے کہتا رہتا ـــــــــــ

''ساتھیو!

کب تک چپ چاپ ظلم سہتے رہو گے۔ دیکھو اپنے اپنے ویران گھروں کو' اپنے پریواروں کی چتاؤں سے چٹختی ہوئی چنگاریوں کو ـــــــ آنسو انسان کو کمزور اور بزدل بنا دیتے ہیں۔ یہ ظلم غریبوں پر آج نہیں صدیوں سے ہوتے آ رہے ہیں۔ ہر طرح سے شکار صرف غریب ہی ہوئے ہیں لیکن ہم اسی طرح ظلم سہتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب ہمارا نام و نشان مٹا دیا جائے گا۔ ساتھیو' آؤ میرا ساتھ دو' میں تمہیں راستہ دکھاتا ہوں پھر دیکھو کس طرح تمہاری یہ بظاہر اپاہج زندگی اپنے پیروں پر کھڑی ہو جاتی ہے اور تم محض ایک رینگتے کیڑے نہ رہ کر ایک مکمل وجود بن جاؤ گے اور یہ وجود ہر طرح سے محسوس کیا جائے گا ـــــــ''

اور انّا گاؤں کا ہر دلعزیز ساتھی بنتا چلا گیا ـــــــ نئی نئی باتیں ظہور میں آنے لگیں۔ انّا سارا سارا دن گاؤں گاؤں پھرتا رہتا۔ اُس کا دماغ ہمیشہ نئی نئی باتیں سوچتا رہتا۔ پاؤں کی گردش بدستور جاری رہتی' معمولی معمولی بات پر وہ طوفان برپا کر دیتا جس کے باعث دوسرے لوگوں میں بھی احتجاج کی قوت بڑھ گئی تھی۔ بے چینی' قلبی بے چینی سلک اٹھی تھی' نہ جانے کب کہاں انّا آ پہنچے اور.........'

ـــــــــــ شام ہونے کو آئی تھی' دھوپ نڈھال سی آنگن سے رخصت ہو رہی تھی' جیسے ہی پھلمتیا نے گھر میں قدم رکھا انّا کو چارپائی پر بیٹھا پایا۔ وہ حیرت زدہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اُس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ انّا اور اُس کے گھر ـــــــ؟

''آج ہم رات یہیں گزاریں گے' صبح ایک مہم پر جانا ہے۔ باقی ساتھی پیچھے سے آ رہے ہیں ـــــــــــ'' انّا نے اُسے اطلاع دی۔

پھُلمتیا بغیر کچھ کہے اندر چلی گئی تھی اور کھانے کا انتظام کرنے لگی تھی۔

آدھی رات تک وہ چھپّر پر نظریں جمائے سوچتی رہی۔ دور سے آنے والی کسی بھیانک آندھی کا شور اُسے سنائی دیتا رہا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے دھندلے چاند کا دھندلا آسمان ڈوبتا اُبھرتا رہا۔ کس کس کی جان جائے گی۔ کتنے پرندے زخمی ہوں گے۔ اُس کے دل کی دھڑکنیں گھٹتی بڑھتی رہیں' وہ کھاٹ پر کروٹ بدلتی رہی۔ بالآخر وہ بے چینیوں کی کشاکش سے تھک کر چور ہو گئی اور رات کے کوئی تیسرے پہر نیند نے اُس کی بے قراری کو قرار دے ہی دیا ـــــــــــ'

صبح نمودار ہوتے ہی وہ اُٹھ بیٹھی تھی اور جلدی سے انّا کی کھاٹ تک پہنچی لیکن انّا نہ جانے کس وقت چلا گیا تھا۔ وہ باہر آئی اور دور تک

گاؤں سے باہر جانے کے راستہ کو تکتی رہی۔ اکاّ دکاّ لوگ آجا رہے تھے' بس ـــــــ ' آج کیا ہونے والا تھا؟ ـــــــ وہ دیر تک اپنے آپ سے پوچھتی رہی اور جواب نہ پاکر مزید اُلجھتی رہی۔ سارا دن وہ گھر' صحن اور دہلیز کے چکر لگاتی رہی۔ اس کا دماغ سوچتے سوچتے تھک گیا۔ ذرا دیر ٹھہر کر آرام بھی نہ کر پائی۔ گھر آنگن میں رہتے ہوئے بھی نہ جانے وہ کہاں کہاں بھٹکتی رہی ـــــــ ـــ اناّ کی مہم کا کیا ہوا؟ ـــــــــــ اناّ کے بہت دشمن ہیں۔ سب کی نظروں سے اُسے بچنا پڑتا ہے ـــــــــــ آسمان کا کنارہ کتنا سرخ تھا۔ اسے محسوس ہوتا کہ لمحہ بھر میں آسمان سے خون کی بوندیں ٹپکنے لگیں گی۔ خون خون ـــــــــــ سارا منظر خون خون! ـــــــ

دوپہر سے شام ہونے کو آئی۔ سرمئی اندھیرے کا وجود قریب آتا چلا گیا۔ سب آنے والی رات کو آنکھوں میں بسانے کے انتظام میں لگے تھے۔ پھُلمتیا صحن سے ہوتی ہوئی کمرہ میں داخل ہوئی۔ اُس نے چراغ روشن کر دیا۔ لمحہ بھر میں کمرہ روشن ہو گیا تھا لیکن پھلمتیا کی آنکھوں میں نیند کی آہٹ تک نہیں تھی بس رہ رہ کر اُس کے ذہن میں ایک ہی نام ابھرتا ـــــــ اناّ ـــــــ اناّ ـــــــــــ وہ نام جواب سارے گاؤں کی زبان پر تھا۔ پتہ نہیں وہ کہاں ہوگا؟

پچھلے ہی دنوں کی بات ہے۔ لکھیا جو بابو صاحب کی حویلی میں برتن مانجھنے کا کام کرتی تھی حمل سے رہ گئی تھی۔ بہت پوچھے جانے پر اُس نے بابو صاحب کا نام بتا دیا۔ پھر کیا تھا۔ اناّ کے غصے کی انتہا نہ رہی۔ گاؤں کی عزّت کی بات تھی۔ دو سو آدمیوں کے ساتھ بابو صاحب کی حویلی پر اُس نے دھاوا بول دیا اور حویلی کی دیواروں کو ہلا کر رکھ دیا ـــــــــــ '

عجیب آدمی ہے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ سارا گاؤں اُس کا ہے اور وہ سارے گاؤں کا۔ وہ جو عہد کرتا ہے پورا کرتا ہے۔ کبھی وہ ایک جگہ نہیں ٹکتا۔ آج اس گاؤں میں تو کل دوسرے گاؤں میں۔ رات یہاں تو دن کہیں اور۔ اُس کے پیر میں گویا چرخی لگی ہوتی ہے۔ ہنسی کبھی اس کے چہرے پر نمودار نہیں ہوئی' ہمیشہ تمتمایا ہوا چہرہ اور ساری دنیا کے نظام کو بدل دینے کا عزم ـــــــــــ بھاشن دیتا تو چہرہ کیسا سرخ ہو جاتا۔ وہ کیا کیا کہتا تھا۔ سب بات تو پھُلمتیا کی سمجھ میں نہ آتی مگر کچھ جملے کہیں کہیں سے اُس کو یاد تھے۔ ایک مرتبہ اس نے کہا تھا ـــــــ

''یہ ساری ویوستھا سڑی گلی ہے' جس محکمے میں جایئے وہاں رشوت اور بھرشٹاچار پنپ رہا ہے۔ ہر کوئی ہاتھ میں بھیک کا پیالہ لئے بیٹھا ہے اور ہم لوگ بھی اس کے پیالے میں کچھ نہ کچھ ڈالنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ہمیں یہ عادت بدلنی پڑے گی۔''

تقریر ختم ہو گئی۔ چند جوشیلے نوجوانوں نے اناّ کو گود میں اُٹھا لیا ـــــــ کامریڈ ''اناّ'' کو لال سلام......... لال سلام لال سلام!'' ـــــــ بڑا جوشیلا اور بدن میں خون کی رفتار کو تیز کر دینے والا منظر تھا۔ پھُلمتیا مجمع سے کنارے کھڑی سوچ رہی تھی ـــــــ آج کسی آفیسر کی ضرور شامت آنے والی ہے.........

یہ آئے دن کا معمول تھا۔ جب کسی کے خلاف احتجاج کرنا ہوتا' وہ لوگوں کو جمع کرتا' جوشیلے بھاشن دیتا اور احتجاجی طریقے پر عمل کر بیٹھتا۔

کارومستری کے پریوار کو بے دردی سے ماردیا گیا تھا۔اس کا قصور بس یہی تھا کہ اس نے مکھیا کے خلاف کورٹ میں گواہی دی تھی۔ سچ بولنے کی اتنی بڑی سزا؟

——ایک سچ کے عوض پانچ پانچ لوگوں کی جانیں!——اور دوسری صبح انّا مہم پر نکلا تھا اور مکھیا کے ظالم ہاتھوں کا وجود ختم ہوگیا تھا——'

یہ سلسلہ کب ختم ہوگا؟—— کیا اکیلا انّا ساری دنیا سے لڑ پائے گا؟ دفعتاً اُس کا ذہن انّا پر آکر ٹھہر گیا——'

اب کیا ہوگا؟

انّا کو ہر حادثہ کی خبر ہو جاتی ہے اور کسی نے اُس تک آج کے حادثہ کی خبر ضرور پہنچا دی ہوگی۔انّا پر کیا گزر رہی ہوگی یہ وہ اچھی طرح سمجھ رہی ہے۔اگر وہ جیل میں نہ ہوتا تو کب کا یہاں پہنچ چکا ہوتا اور جن عدالت لگا کر کوئی نہ کوئی فیصلہ لے چکا ہوتا اور پھر کسی بڑے کانڈ کی خبر قومی اخباروں کی موٹی موٹی سرخیاں بن جاتیں——'

یہ بہاؤ کہاں جا کر تھمے گا؟

کیا اکیلا انّا اس نظام کو بدل دے گا یا ہر گھر میں ایک انّا کا وجود اب لازمی ہے؟ ہر گاؤں ہر قصبے اور ہر گھر میں انّا کی ضرورت ہے جو موجودہ نظام کو بدلنے میں معاون ہو سکے لیکن اس قدر انّا آئے گا کہاں سے؟—— برسوں میں صرف ایک انّا پیدا ہوتا ہے اور بس ایک دن میں اُسے ختم کر دیا جاتا ہے یا جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا جاتا ہے——'

تو کیا ہر ماں کو ایک انّا.........؟

پھُلمتیا یہ سب سوچ ہی رہی تھی کہ دھیرے دھیرے واپس جاتی جیپ پر بیٹھے دو شخص جلے مکانات کو تمسخر سے دیکھتے ہوئے کہہ رہے تھے——

''بڑے نکسلائٹ بنتے ہیں سالے!ایک ہی رات میں ٹھنڈے پڑ گئے!''

پھُلمتیا اچانک سلگ اٹھی۔وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور چلاّ کر بولی——

''انّا کو آنے دو سالو! پتہ چل جائے گا!''——پھُلمتیا کی آواز ٹھنڈا کرنے والوں تک پہنچی یا نہیں لیکن وقت کے گنبد میں اُس کی آواز دیر تک گونجتی رہی——'

انّا کو آنے دو——!

انّا کو آنے دو——!!

●●

جب تک ہم سب مل کر ایک دوسرے کی مدد نہ کریں گے یہ کام نہ ہوگا اور تو اسی طرح اپنی جھاڑو لئے میرے ذہن کے دروازے پر کھڑا رہے گا اور میں کوئی عظیم افسانہ نہ لکھ سکوں گا اور جس میں انسانی روح کی مکمل مسرّت جھلک اٹھے اور کوئی عظیم معمار عمارت تعمیر نہ کر سکے گا۔ جس میں ہماری قوم کی عظمت اپنی سربلندیاں چھو لے اور کوئی ایسا گیت نہ گا سکے گا جس کی پنہائیوں میں کائنات کی آفاقیت چھلک چھلک جائے۔ یہ بھرپور زنگی ممکن نہیں جب تک تو جھاڑو لئے یہاں کھڑا ہے۔
اچھا ہے کھڑا رہ۔ پھر شاید وہ دن کبھی آجائے کہ کوئی تجھ سے تیری جھاڑو چھڑا لے اور تیرے ہاتھوں کو نرمی سے تھام کر تجھے قوس و قزح کے اُس پار لے جائے۔

(افسانہ "کالو بھنگی" کرشن چندر)

ڈوبتا اُبھرتا ساحل

موسم گرما کی سخت دھوپ میں آگ اگلتے راستوں سے کچھ پرے، سُگنی داتون بیچتی رہتی۔ منہ اندھیرے وہ بستر سے اٹھ کر ہتھیلیوں سے آنکھوں کو ملتی گھر سے نکل جاتی۔ وہ چند روپیوں کے لیے سورج میں اپنے جسم و جاں کو جلاتی رہتی اور جب اُسے یقین ہو جاتا کہ اب وہاں کوئی اُس کے داتون کو خریدنے والا نہیں ہے تب وہاں سے داتون والے کے پاس پہنچتی۔ اُس کے پیسے ادا کرتی اور باقی بچے ہوئے پیسے لے کر گھر کی طرف چل پڑتی۔

لمبی لمبی تارکول کی سڑکوں پر شور کے کانٹے اُگ رہے ہوتے مگر سگنی کے گھر وہ شور شرابہ اور ہنگامہ کہاں؟— چار لوگوں پر مشتمل اس کا چھوٹا سا پریوار ہے۔ ماں، بابو جی، وہ اور تین سال کا چھوٹا بھائی۔ ماں بابو جی کوڑے اٹھانے کا کام کرتے تھے۔ صبح ہوتے ہی ٹھیلہ لے کر دونوں نکل پڑتے۔ ماں گھر گھر جا کر کوڑے مانگتی اور بابو جی کوڑے کو ٹھیلہ میں جمع کرتے، جب ٹھیلہ کوڑے سے بھر جاتا۔ اُسے کسی ویرانے میں پھینک آتے—'

حسب معمول سُگنی روز داتون بیچتی لیکن بس اسٹاپ پر اس کی عمر کے دوسرے بچے بھی داتون بیچا کرتے تھے۔ اس لیے اس کی آمدنی اتنی نہیں ہوتی جتنی ہونی چاہیے تھی۔ اس لیے وہ کبھی اسٹیشن کی طرف بھی نکل جاتی۔ اسٹیشن پر اس کی اچھی آمدنی ضرور ہو جاتی لیکن وہاں اُسے پولس کا خوف دامن گیر رہتا۔ وہ داتون بیچنے کے پیسے مانگتا ورنہ ڈنڈے مار کر بھگا دیتا۔ سُگنی چھپ چھپا کر داتون بیچتی رہتی اور جیسے ہی پولس پر نظر پڑتی وہ بھاگ کھڑی ہوتی—'

سُگنی دھیرے دھیرے روز اسٹیشن جانے لگی اور گھنٹے دو گھنٹے داتون بیچ کر بھاگ آتی کیونکہ اسٹیشن پر نگرانی کرنے والا سپاہی شاید دیر سے آتا تھا۔ جب تک سگنی دس بیس روپے کے داتون بیچ چکی ہوتی لیکن وہ اس سے بے خبر تھی کہ اسٹیشن کا سپاہی کسی خاص مقام سے بیٹھے بیٹھے اسے دیکھتا رہتا تھا۔ بالآخر ایک دن اس ادھیڑ عمر سپاہی نے اسے آدبوچا۔ سگنی معافی مانگتی رہی، ہاتھ پیر جوڑتی رہی، چھوٹ کر بھاگ جانا چاہی مگر سپاہی کی گرفت مضبوط تھی۔ اس نے سگنی کی کلائی مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اور گالیاں بک رہا تھا۔ پھر وہ اسے لگ بھگ گھسیٹتا ہوا پلیٹ فارم سے دور ایک بہ نسبت سنسان علاقے میں لے گیا۔ اُدھر ایک بوسیدہ ریل کا ڈبہ پٹری کے کنارے لگا تھا۔ وہ سگنی کو لے کر اس ڈبے میں چلا گیا۔ سگنی کی آنکھوں میں اندھکار اور خوف کے سائے پھیل گئے۔ سپاہی نے بوسیدہ ڈبے کا بوسیدہ دروازہ بند کر دیا۔ سگنی خوف

سے کانپ رہی تھی۔ سپاہی آگے بڑھ کر اس کے جسم کو ٹٹولنے لگا۔ سگنی کسمسائی مگر سپاہی کی ڈانٹ نے اس کی آواز کا گلا دبا دیا—'

''چپ رہ سالی۔نہیں تو ابھی اندر کردوں گا۔''

سگنی کی زبان بند تھی مگر اس کی آنکھوں کے آنسو بول رہے تھے۔اُن آنسوؤں میں اس کا اپنا کرب چیخ رہا تھا۔اس کی عمر ہی کیا تھی۔یہی کوئی دس سال۔سپاہی بھی زیادہ دیر وہاں نہیں ٹک سکا مگر سگنی ایک بت کی طرح دیر تک خاموش بیٹھی رہی۔

اس روز اس کا پورا دن کرب واضطراب میں گزرا۔دن کے بعد رات آگئی۔رات تیزی سے بھاگتی رہی اور وہ دیر تک جاگتی رہی۔سوچ کے دائرے اُسے اپنے شکنجے میں کسے جا رہے تھے۔اس کی سوچ کا دائرہ پھیلتا جا رہا تھا۔اس نے دماغ پر زور ڈالنا شروع کر دیا تھا۔اس کی نظروں کے سامنے بار بار اس سپاہی کا چہرہ کالے ناگ کی طرح نمودار ہوتا جو بار بار اس کو ڈستا جاتا اور ہر بار وہ تڑپ کر رہ جاتی جیسے کوئی اس کے پورے وجود کو کچلے دے رہا ہے اور وہ اس سے نجات حاصل کرنا چاہ رہی ہے۔

سگنی نے ایک گہری سانس لی اور آسمان کی طرف اپنی نظریں اٹھائیں۔آسمان بالکل شانت تھا۔اسے اس وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس کی محفوظیت کی ساری چھتیں ٹوٹ گئی ہیں۔اس کے وجود کا ہر انگ پسینے کی بوندوں کی طرح سردی بھری فضا میں تھرتھرا رہا تھا۔سگنی نے سوچا وہ اپنی محفوظیت کو برقرار رکھ سکے گی یا ساری دیواریں منہدم کر کے آزاد ہو جائے گی۔وہ ماں بابو جی کو ساری باتیں بتا دے یا اپنے اندر ہی دفن کر لے۔وہ بہت دیر تک کشمکش میں گھری رہتی ہے اور نہ جانے کب نیند کی دیوی آکر اس کے اوپر اپنی چادر تان دیتی ہے۔

پیٹ کی آگ نے سگنی کو پھر سے داتون بیچنے کے لیے مجبور کر دیا۔وہ اٹھی اور داتون والے کے پاس پہنچ گئی۔داتون والے نے داتون دے دیا۔وہ اسے لے کر سیدھے اسٹیشن پہنچ گئی اور بے دھڑک داتون بیچنے لگی۔اس کی نظر اس سپاہی پر پڑی مگر اس کی پروا کئے بغیر وہ داتون بیچتی رہی۔سپاہی نے بھی اسے دیکھا مگر کچھ نہ بولا صرف مسکرا کر رہ گیا۔

اب وہ بے دھڑک اسٹیشن پر داتون بیچتی جیسے اسے کسی کا خوف نہ ہو۔سپاہی بھی اسے روز دیکھتا مگر کچھ نہ کہتا۔البتہ جب اس کے اندر کا ناگ پھن اٹھاتا تو وہ سگنی کو لے کر اسی بوسیدہ ڈبے میں چلا جاتا۔اب سگنی بھی مزاحمت نہیں کرتی۔اس نے اسے بھی اپنے مختلف کام کی طرح معمول میں شامل کر لیا تھا۔

وقت کی زنجیروں میں ہر شخص گرفتار ہے۔کوئی زنجیر توڑ کر نکل جاتا ہے۔کوئی زندگی بھر اسی میں گرفتار رہتا ہے۔کوئی زنجیر خود پہن لیتا ہے اور کسی کو وقت پہنا دیتا ہے۔وقت ہر لمحہ ایک زنجیر جوڑتا رہتا ہے۔ایک سرا کبھی دوسرے سے نہیں ملتا۔حالانکہ اس سرے کا پتہ لگاتے لگاتے انسان موت کی زنجیر اپنے گلے میں ڈال لیتا ہے۔

کئی دن تک سگنی اسٹیشن داتون بیچنے نہیں آئی تو سپاہی کو تشویش ہوئی کہ آخر سگنی کیوں نہیں آرہی ہے۔دن اسی طرح گزرتے گئے۔آخر ایک ہفتے کے بعد پھر سگنی اسٹیشن پر داتون لے کر نمودار ہوئی۔اس کا چہرہ بالکل اترا ہوا تھا جیسے وہ خوب روئی ہو۔غمگین چہرے پر کوئی ایسا دکھ تھا جسے وہ چاہ کر بھی نہیں چھپا پا رہی تھی۔سپاہی نے اُسے بغور دیکھا اور سوچنے لگا— ''یہ سگنی کو کیا ہو گیا۔ہرنی کی طرح چوکڑی بھرنے والی

لڑکی آج اتنی بجھی بجھی کیوں ہے... اس کی آواز بھی پھٹی پھٹی ہے۔ وہ ٹھیک سے گاہک کو اپنی طرف متوجہ بھی نہیں کر پا رہی ہے۔''

سپاہی اس کے پاس پہنچ گیا۔ سگنی نے سپاہی کو نگاہ اٹھا کر دیکھا اور سر جھکا کر کھڑی ہوگئی۔

''کیا بات ہے سگنی؟ — آج تو اتنی اداس کیوں ہے؟''

سگنی خاموش رہی۔

''بتا نا کیا بات ہے؟''

سگنی کی آنکھوں سے جھرنے پھوٹ پڑے۔ وہ سسکتے ہوئے بولی۔

''ہمرے ماں باؤجی سب مر گیئے۔''

''کیسے؟''

''جھونپڑیا میں آگ لگ گئی تھی.... بہت لوگ مر گیئے...''

سپاہی کو یاد آیا۔ اس نے اخبار میں پڑھا تھا کہ سیلم پور پشتہ کی جھونپڑیوں میں آگ لگ گئی تھی۔ جس میں پچاس لوگ جل کر مر گئے تھے۔ سپاہی کو سچ مچ بہت افسوس ہوا۔ وہ سگنی کو ہمدردی سے دیکھنے لگا جو مسلسل روئے جا رہی تھی۔ جیسے کئی دن کے بعد بادل گھرنے کے بعد بارش ہوئی تھی —'

''رومت سگنی... رومت... یہ سب بھگوان کی لیلا ہے'' — سپاہی نے اسے ڈھارس بندھائی۔

''اب ہمرا اس دنیا میں کوئیو نہیں... ہم ایک دم اکیلی رہ گئی'' — سگنی ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔

'دکھ کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ دکھ تو بس دکھ ہے۔ دل سے آنکھوں تک دکھ ہی دکھ۔ دُکھ کی وجہ سے ہی آنکھیں ساون بھادو بن جاتی ہیں۔ دل رونے لگتا ہے مگر دکھ نہیں پگھلتا لیکن نہ جانے کیا ہوا کہ سپاہی ایک دم موم کی طرح پگھل گیا۔ اس کی آنکھوں کا کوئی کنارہ ضرور نم ہو رہا تھا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر ایک بھرپور نگاہ سگنی پر ڈالی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف چل پڑا۔ سگنی نے نفرت سے سپاہی کو دیکھا۔ وہ سمجھ گئی کہ آج بھی وہ اُس ڈبے میں لے جائے گا۔ غصہ تو بہت آیا مگر اپنی زبان سے کچھ نہ کہا۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتی رہی لیکن آج سپاہی اس بوسیدہ ڈبے کی طرف جانے کے بجائے اسٹیشن کے باہر آ گیا۔ سگنی کو حیرت ضرور ہوئی لیکن پھر اس نے سمجھا کہ ہوسکتا ہے اب کوئی نئی جگہ لے جائے۔ اسٹیشن کے کچھ ہی فاصلے پر سپاہی کا کوارٹر تھا۔ وہ اپنے کوارٹر کے سامنے پہنچ گیا۔ دروازے پر اس نے دستک دی۔ اس کی بیوی مایا نے دروازہ کھولا۔ ایک لڑکی کے ساتھ شوہر کو دیکھ کر اسے حیرت ہوئی —

''کون ہے یہ؟... کس کو ساتھ لائے ہو؟'' — اُس نے کھرے لہجہ میں سپاہی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی دو سوال داغ دیے۔ سپاہی خاموش رہا۔ وہ سگنی کو لے کر گھر میں داخل ہو گیا۔ مایا بھی اس کے پیچھے پیچھے آئی —

''میں پوچھتی ہوں کون ہے یہ ——؟'' مایا سپاہی کے سامنے دیوار کی طرح کھڑی ہوگئی۔

''یہ ایک یتیم اور غریب بچی ہے... پچھلے ہفتے سیلم پور پشتہ کی جھونپڑیوں میں جو آگ لگی تھی۔ اس میں اس کے ماں باپ جل کر

مر گئے۔ اب اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے... اب یہ یہیں رہے گی ہمارے پاس... ہماری بھی کوئی اولاد نہیں ہے... یہ رہے گی تو گھر آباد ہو جائے گا''— سپاہی نے نہ صرف تفصیل ہی بتائی بلکہ اپنا فیصلہ بھی سنا دیا۔ مایا نے سگنی کو سر سے پیر تک غور سے دیکھا۔ کچھ دیر یونہی دیکھتی رہی۔ سوچتی رہی۔ دھیرے دھیرے اس کے چہرے پر قائم سختی دور ہوتی چلی گئی اور اس نے پھر بڑی اپنائیت سے کہا—

''آ بیٹی، میرے پاس آ...''

سگنی سپاہی کی باتیں سن کر حیرت میں پڑ گئی تھی۔ اس نے ایک نظر سپاہی کو دیکھا۔ پھر مایا کو اور مایا کے پاس آ گئی۔ مایا نے اس کے گال تھپتھپائے—

''کتنا پیارا چہرہ ہے۔ کیا نام ہے؟''—

''سگنی!''

''نہیں آج سے تیرا نام سنگیتا رہے گا... میں تجھے بیٹی کی طرح پالوں گی... چل پہلے نہا لے''— وہ سگنی کو لے کر باتھ روم کی طرف بڑھتی ہے۔ پھر رک کر سپاہی سے مخاطب ہوتی ہے— ''سنو جی، جاؤ اس کے لیے ایک دو اچھے کپڑے خرید لاؤ...''

''ابھی لے کر آیا!''— سپاہی کہتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔

سگنی سمجھ نہیں پاتی ہے کہ سپاہی کے اندر اچانک یہ تبدیلی کیسے آ گئی۔ اب تک میرے بدن سے کھیلنے والا مجھے اپنے گھر لے آیا اور ایک طرح سے اس نے اپنی بیٹی تسلیم کر لیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس میں بھی اس کی کوئی مصلحت ہو کہ جب گھر پر رہوں گی تو جب چاہے گا میرا استعمال کرے گا۔ ذہنی طور پر اس نے خود کو اس کے لیے بھی تیار کر لیا تھا کہ جب اس کا مقدر ہی یہی ہے تو پھر اس سے گھبرانا کیسا—'

وقت گزرتا جاتا ہے۔ مایا سگنی کو بالکل اپنی بیٹی کی طرح پرورش کرنے لگتی ہے۔ سپاہی بھی اس پر شفقت لٹانے لگتا ہے لیکن وہ کبھی نظر ملا کر بات نہیں کرتا جیسے وہ اس کا مجرم ہو۔

سگنی اب اور بھی حسین اور جوان نظر آنے لگی تھی۔ مایا نے اُسے پہلے تو خود پڑھایا پھر ٹیوٹر رکھ کر اُسے دسواں پاس کروایا۔ اب سگنی اخبار، میگزین بھی پڑھنے لگی تھی۔ ٹی۔ وی پر سماچار بھی دیکھتی۔ اُسے سمجھتی بھی اور مایا سے اس پر اظہارِ خیال بھی کرتی—'

سگنی کو ایسا محسوس ہوتا گویا کسی نے اُسے جھولے پر بٹھا کر بڑی لمبی پینگ دے دی ہو۔ اس کے چہرے سے خوشی ٹپکی پڑتی تھی مگر دل دھڑک کبھی جا رہا تھا۔ دل کے اندرونی گوشے میں ایک کانٹا سا چبھتا رہتا۔ اس کی آنکھیں خوف زدہ دروازے کو تکتی رہتیں— جب رات اس کے کمرے میں اندھیرے کے ساتھ سمٹ جاتی تو یاد دلاتی اُسے ماضی کے وہ ہر ایک پل جو اس نے سپاہی کے ساتھ بوسیدہ ریل کے ڈبے میں گزارے تھے۔ وہ ان لمحوں کو یاد کر کے اُداس ہو جاتی۔ اس کی سوچ بکھرنے لگتی۔ فقط اُداس لمحے کا نام زندگی تو نہیں—

لمحے کبھی روشنی ہیں۔

لمحے کبھی چاندنی ہیں۔

لمحے کبھی راگنی ہیں۔
کبھی کسی پل چمکنے لگتا سورج—— سگنی کی زندگی کا بھی سورج روشن ہوگیا تھا۔ اپنی تابنا کی کے ساتھ۔

سپاہی کے اندر بھی ایک کانٹا تھا جو ہمیشہ اُسے چبھتا رہتا۔ اُس نے سگنی کو زبان سے بیٹی تو بنالیا تھا لیکن اس کی چڑھتی جوانی اور سندرتا کو دیکھ کر کبھی کبھی اس کے اندر کا سانپ پھن اٹھا کر سگنی کو ڈسنے کے لیے اُکساتا مگر اُسے مایا کا ڈر بھی رہتا۔ مایا سایہ کی طرح اس کے ساتھ رہتی۔ جب کچن میں کھانا بناتی اس وقت بھی اپنے ساتھ رکھتی اور اس سے باتیں کرتی رہتی۔ دیر رات تک اسے اپنے پاس بٹھاتی اور اپنے بیتے دنوں کی باتیں اُسے سناتی رہتی۔ سپاہی یہ سب دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھتا رہتا۔ اُسے ماں بیٹی کا یہ پیار کھلنے لگا تھا۔ وہ ہر ممکن کوشش کرتا کہ سگنی اس کے کمرے میں بھی آئے، اُس سے باتیں کرے، اس کا دل بہلائے لیکن سگنی شاید سپاہی کے پاس آنے سے بھی ڈرتی تھی، کتراتی تھی۔ اُسے اس بات کا بھی ڈر تھا کہ اگر مایا کو پتہ چل گیا تو شاید اسے ہی خراب لڑکی کہہ کر گھر سے نکال دے کہ اس کے پتی پر اس نے ڈورے ڈالنے شروع کردیے ہیں۔
اب سگنی الگ کمرے میں سوتی تھی کیونکہ اسے دیر تک پڑھنے کی عادت ہوگئی تھی۔ وہ مختلف Subject کی کتابوں میں اپنا زیادہ تر وقت گزارتی کہ ماضی کا کوئی بھی پل وہ اب اپنے ذہن کے نہاخانے میں رکھنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس سے فرار حاصل کرنا چاہتی تھی اور ماضی کی یادوں سے چھٹکارا پانے کا حل اس نے کتابوں میں تلاش لیا تھا——'
آج کی رات اپنے برہنہ جسم پر سیاہ راکھ مل کر نمودار ہوئی تھی۔ ہوائیں دیوانہ وار رقص کررہی تھیں۔ سیاہ بادل اُمڈے چلے آتے تھے۔ رات کے ایک بج رہے تھے۔ سپاہی کی آنکھوں سے آج نیند نے اپنا خیمہ اکھاڑ لیا تھا۔ اس کا ذہن بار بار سگنی پر جاکر مرکوز ہو جاتا۔ اسے کبھی لگتا کہ اس نے گھر میں لاکر سگنی کو غلطی کی ہے۔ اسے اسی حال میں چھوڑ دیتا تو جب چاہتا اس کا استعمال کرتا لیکن گھر میں لاکر اپنے لیے مشکل پیدا کرلی ہے۔ مایا کو پتہ چلے گا تو کیا سوچے گی۔ وہ تو اسے بالکل اپنی بیٹی ہی سمجھتی ہے۔ جہاں بھی جاتی ہے ساتھ لے کر جاتی ہے۔ ایسی حالت میں کیا وہ سگنی سے لطف اندوز ہوسکتا ہے۔ لیکن اس کے کسی گوشے سے آواز آتی——اس میں حرج ہی کیا ہے۔ وہ تمہاری سگی بیٹی تو نہیں ہے۔ گھر میں رکھ لینے سے کوئی بیٹی تو نہیں ہو جاتی پھر سگنی کو بھی تو سب کچھ پتہ ہے۔
مختلف قسم کی کشمکش میں گھرا سپاہی اپنے کمرے سے بالآخر نکلتا ہے اور سگنی کے کمرے کی طرف چل پڑتا ہے۔ اس کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ سگنی گہری نیند میں سوئی تھی۔ نائٹ بلب میں وہ اور بھی حسین لگ رہی تھی۔ دوپٹہ ایک طرف سرک گیا تھا اور جوانی کے نشیب وفراز سپاہی کے ضبط کے باندھ توڑے ڈال رہے تھے۔ وہ دھیرے دھیرے اس کے پلنگ پر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں کپکپن شروع ہو جاتی ہے اور چہرے پر پسینے کی بے شمار بوندیں لرزنے لگتی ہیں۔ اس کشمکش کے عالم میں اس کا ہاتھ سگنی کے بدن سے جاٹکراتا ہے۔ سگنی کی آنکھ اچانک کھل جاتی ہے اور وہ چونک کر اٹھ بیٹھتی ہے۔ سپاہی کو اپنے قریب بیٹھا دیکھ کر اس کی آنکھوں میں نفرت کے شعلے بھبھک اٹھتے ہیں۔ وہ اسے نفرت سے دیکھتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ ڈوپٹہ دور پھینک دیتی ہے اور شمیض اتارنے کے لیے ہاتھ بڑھاتی ہے... سپاہی

کے اندر جیسے ایک بجلی سی کوندتی ہے۔ وہ لپک کر سگنی کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔ اس کا دوپٹہ اٹھا کر اسے قاعدے سے اوڑھاتا ہے۔ اس کا ایک پلو سر پر ڈالتا ہے اور بلکتے ہوئے اس کی پیشانی پر ایک شفیق بوسہ ثبت کرتا ہے اور سر جھکائے دھیرے دھیرے کمرہ سے نکل جاتا ہے۔

سگنی کے اندر بھڑکتے ہوئے شعلے اچانک سرد ہو جاتے ہیں اور اُسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آج سچ مچ اس کا کھویا ہوا باپ اس کو مل گیا—!

●●

لیکن وزیر اعظم صاحب کی گاڑی نہیں رکی اور وہ ان چھ ساڑھیوں کو نہیں دیکھ سکے اور تقریر کرنے کے لئے چوپاٹی چلے گئے ۔اسلئے اب میں آپ سے کہتا ہوں کہ اگر کبھی آپ کی گاڑی ادھر سے گزرے تو آپ ان چھ ساڑھیوں کو ضرور دیکھیں۔ جو مہا لکشمی کے پل کے بائیں طرف لٹک رہی ہیں اور پھر آپ ان رنگا رنگ ریشمیں ساڑھیوں کو بھی دیکھیے جنہیں دھوبیوں نے اسی پل کے دائیں طرف سوکھنے کے لئے لٹکا رکھا ہے۔ اور جو ان گھروں سے آئی ہیں جہاں اونچی اونچی چمنیوں والے کارخانوں کے مالک یا اونچی اونچی تنخواہوں کے پانے والے رہتے ہیں۔ آپ اس پل کے دائیں بائیں دونوں طرف دیکھیے اور پھر اپنے آپ سے پوچھئے کہ آپ کس کی طرف جانا چاہتے ہیں۔ دیکھیے! میں آپ سے اشتراکی بننے کے لئے نہیں کہہ رہا ہوں۔ آپ کو جماعتی جنگ کی تلقین بھی نہیں کر رہا ہوں، میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ مہا لکشمی کے پل کے دائیں طرف ہیں یا بائیں طرف۔

(افسانہ "مہا لکشمی کا پل" کرشن چندر)

پیاسی ہے زمیں‘ پیاسا آسماں

دروازہ کھولتے ہی نشی اپنی نوکرانی منکی پر برس پڑی——

’’یہ کوئی آنے کا وقت ہے۔ بچوں کو اسکول جانا ہے۔ صاحب کو دفتر اور مجھے کالج۔ میں ادھر دیکھ رہی ہوں تمہارے اوپر چربی کچھ زیادہ ہی چڑھ گئی ہے۔ دیکھو اگر کام کرنا ہے تو صبح چھ بجے آ جاؤ‘ نہیں تو کام چھوڑ دو۔ بہت کام کرنے والی مل جائے گی۔‘‘

’’مالکن کا بتاؤں۔ میرا آدمی روج دارو پی کر آتا ہے اور رات بھر گالی گلوج‘ مار پیٹ کرتا رہتا ہے۔ اِسی واسطے جرا بھور میں آنکھ لگ جانے کے کارن دیر ہو جاتی ہے——‘‘ منکی اپنی صفائی پیش کرتی ہے۔

’’دیکھو وہ ہم نہیں جانتے کہ تمہارے گھر میں کیا ہوتا ہے‘ ہم کو تو اپنا کام چاہئے۔ تمہیں ہر مہینے دو سو روپیہ دیتے ہیں‘ کھانا دیتے ہیں پھر کام بھی مجھے پورا چاہئے——‘‘ نشی کی آج تیوری چڑھی ہوئی تھی۔

’’ٹھیک ہے مالکن اب وکت پر آئیں گے‘‘—— منکی خاموش رہنا ہی بہتر سمجھی۔

’’اچھا جاؤ اور جلدی جلدی سارا کام نپٹاؤ۔‘‘

’’جی مالکن!‘‘

ابھی نشی پلٹ کر دوسرے کمرے کا رُخ کرنے ہی والی تھی کہ اُس کے شوہر راجیش نے بغل والے کمرے سے آواز دی——

’’نشی!‘‘

’’جی ابھی آئی‘‘—— نشی راجیش کے کمرہ میں پہنچ گئی۔

’’ذرا دیکھو تو میری ٹائی کہاں ہے‘‘—— راجیش رومال سے چشمے کو صاف کرتا ہوا بولا۔

’’وہ تو سوٹ کے ساتھ ہی تھی‘‘—— نشی وارڈ روپ کھولتی ہے اور تلاش کرنے لگتی ہے۔

’’یہ رہی اِدھر گری ہوئی تھی۔‘‘

راجیش شیشے کے سامنے کھڑا ہو کر ٹائی باندھتا ہے——

’’آج دفتر میں ایک میٹنگ ہے اس لئے دیر سے لوٹوں گا۔‘‘

''اور بچے؟''

''بچوں کو تم گاڑی سے لے لینا''——راجیش بریف کیس اُٹھاتا ہوا باہر نکل جاتا ہے۔

راجیش ایک کمپنی میں مینجر ہے اور نشی ایک کالج میں لکچرر۔ اُن کے دو بچے بھی ہیں۔

منکی کے وقت کا سورج بوڑھا ہو چلا تھا۔ وہ وقت کے سورج کی تیز دھوپ میں برسوں سے تپ رہی تھی۔ اُس کی زندگی میں کوئی درخت سایہ دار نہ تھا۔ اس کا شوہر کاروایک تاڑ کے درخت کی مانند تھا جو کسی کو سایہ نہیں دیتا۔ وہ دن بھر اِدھر اُدھر چھوٹے موٹے کام کرتا اور شام کو لوٹتا تو داروکی دُکان پر ضرور جاتا۔ دارو پیتا اور گھر لوٹ کر منکی کو مارتا پیٹتا۔ کبھی منکی کا لایا ہوا کھانا کھا کر یا کبھی بغیر کھائے ہی سو جاتا۔ منکی اوّل تو دن بھر نشی کے یہاں کام کرتی، پھر رات کو شوہر کی اذیّت سہتی!——اُس کے دو بچے تھے ایک سات سال کی بیٹی پارو اور ایک بیٹا جو ایک سال کا ہو گیا تھا——منکی صبح اُٹھتے ہی نشی کے گھر کام کے لئے چلی جاتی تب اُس کی بیٹی پارو ہی اُس بچے کی دن بھر دیکھ بھال کرتی۔ آدھا کیلو دودھ گوالہ دے جاتا جس میں کچھ پانی ملا کر دن بھر پلاتی رہتی۔ منکی رات کا بچا ہوا باسی کھانا جو چھوڑ جاتی اُسے کھا کر گزارہ کرتی۔ پھر رات کو ماں کھانا لے کر لوٹتی تو کھاتی اور سو جاتی۔

دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ منکی اپنے کام میں مشغول تھی۔ نشی صوفے پر بیٹھی کوئی رسالہ پڑھ رہی تھی۔ آج اس کی کلاس نہیں تھی۔ راجیش دفتر گیا ہوا تھا اور بچے اسکول۔ اسی پل پارو بلکتی ہوئی بچے کو لے کر گھر میں داخل ہوئی اور سیدھے ماں کے پاس پہنچ گئی۔ وہ پہلے بھی کئی دفعہ ماں کے ہمراہ اس گھر میں آ چکی تھی۔ منکی اپنے بچے کی آواز پہچان گئی اور کچن سے باہر آئی——

''کیا ہوا پارو؟''

''ماں آج دودھ والا نہیں آیا۔ ببوا صبح سے رو رہا ہے۔''

''اوہ! اُس گوالہ پر آپھت ٹوٹے۔ بچے کا بھی کھیال نہیں کرتا۔ اب کیا کریں۔''

مُنکی بچے کو گود میں لے کر چھاتی سے لگا لیتی ہے اور اپنا دودھ پلانے کی کوشش کرتی ہے مگر اُس کی چھاتی میں بھی دودھ نہیں اُتر رہا تھا۔ وہ کھاتی ہی کیا تھی۔ بس دوپہر کا کھانا۔ رات کے کھانے میں تو اُس کی بیٹی اور اُس کا شوہر بھی شریک ہو جاتا۔ بس دو ایک نوالہ کھا کر ہی رہ جاتی——اُس کا بچہ کسی صورت نہیں بہلتا ہے۔ وہ روتا ہی جاتا ہے۔ مُنکی پریشان ہو جاتی ہے کہ کیا کرے۔ اُس کے پاس پیسے بھی نہیں تھے کہ دودھ خرید کر بچے کو پلا سکے، وہ تڑپ اُٹھتی ہے۔ بالآخر وہ نشی کے پاس جاتی ہے——

''مالکن میرا بچہ بھوک سے بلک رہا ہے۔ آج دودھ والا نہیں آیا ہے۔ تھوڑا سا دودھ دے دیجئے۔ آپ کی بڑی کرپا ہوگی۔''

نشی مُنکی کو بہ غور دیکھتی ہے۔

''مُنکی تم تو جانتی ہو کہ میرے یہاں فاضل دودھ نہیں آتا۔ اتنا ہی آتا ہے جتنا خرچ ہوتا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ میں کہاں سے دوں۔''

''مالکن آپ دیکھئے نا تھوڑا بہت اس بچے کے لئے نکل ہی آئے گا۔''

''کہہ دیا نا، نہیں ہے۔ تم خواہ مخواہ ضد کر رہی ہو''——نشی نے ناگواری سے کہا۔ مُنکی نے خاموشی میں ہی بہتری سمجھی مگر بچہ کے لئے

کچھ کرنا بھی تھا، وہ نشی سے بولی ——

''مالکن ہم ابھی گھر جاتے ہیں۔ ببوا کے لئے دودھ کا انتجام کریں گے۔ واپس آ کر باکی کام نپٹا لیں گے'' —— اور وہ نشی کا جواب سُنے بغیر ہی باہر نکل گئی۔

صبح صادق کی پہلی کرن جب مندروں کے کلس پر پڑی تو جیسے دھوپ نے گنیش جی کی مورتی کو پیاس کا احساس شدت سے دلایا۔ اُن کے ہونٹ سوکھے دکھائی دیئے تو بھگتوں سے دیکھا نہ گیا۔ وہ سب دودھ کا گلاس لے لے کر ایسے دوڑے جیسے واقعی گنیش جی صدیوں سے پیاسے ہیں اور آج وہ اپنی ساری پیاس بجھا کر ہی دم لیں گے۔ لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ گنیش جی کے ہر مندر میں بھگتوں کی لائین لگ گئیں۔ جب یہ خبر نشی تک پہنچی تو وہ بھی دودھ کا گلاس لے کر مندر دوڑی۔ راجیش ابھی تک سویا ہوا تھا۔ نشی دودھ پلا کر لوٹی تو راجیش کو جھنجھوڑ کر جگایا۔

''تم ابھی تک سو رہے ہو۔ یہاں چمتکار ہو گیا۔ گنیش جی دھرتی پر اُتر آئے ہیں اور دودھ پی رہے ہیں۔''

راجیش جاگ گیا ——'

''کیا بکتی ہو؟''

''ارے اُٹھو تو گنیش جی دودھ پی رہے ہیں، جاؤ تم بھی جا کر پلا آؤ۔''

''ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ تمہارا وہم ہے یا کسی کی سیاست ہو گی۔''

''میں سچ کہہ رہی ہوں۔ آپ کو یقین نہیں آتا تو خود پلا کر دیکھ لیجئے'' —— نشی راجیش کو یقین دلانا چاہتی ہے۔

''چلو کوشش کرنے میں کیا حرج ہے'' —— راجیش بھی دودھ کا گلاس لے کر چل پڑا۔

ابھی راجیش گھر سے نکلا ہی تھا کہ مُنکی آ گئی۔

''مُنکی تم نے سنا، گنیش جی دودھ پی رہے ہیں؟''

''ہاں مالکن سُنا تو ہے، میرے محلے میں بھی کئی عورتوں نے جا کر گنیش جی کو دودھ پلایا ہے۔''

''تم نے پلایا کہ نہیں؟''

''مالکن ہم گریب لوگ کہاں سے پلائیں گے؟ بچہ کو تو پینے کھاتر دودھ ملتا نہیں۔ اب گنیش جی بھی دودھ پینے لگے تو دودھ کا اکال پڑ جائے گا۔''

''ارے تو اُس کی فکر چھوڑ اور جلدی سے گنیش جی کو دودھ پلا کر آ۔''

''مالکن میرے پاس دودھ نہیں ہے۔ آج بھی گوالہ ابھی تک دودھ نہیں دے گیا ہے!''

''میں دیتی ہوں'' —— نشی کچن میں جاتی ہے اور گلاس میں بھر کر دودھ لا کر دیتی ہے۔

''جا جلدی جا! کہیں گنیش جی کا پیٹ بھر نہ جائے اور دودھ پینا بند نہ کر دیں'' —— نشی مُنکی کو گلاس تھماتے ہوئے بولی۔

مُنکی بھی گلاس لے کر تیزی سے باہر نکل پڑی۔ اُس کے تیز قدم مندر کی طرف اُٹھ رہے تھے مگر دھیان اپنے بچے کی طرف تھا۔ اگر آج بھی دودھ والا نہیں آیا تو پھر میرا بچہ ——— ؟

اس کے قدم رکنے لگے ——— '

گنیش جی کو پلانے کے لئے مالکن کے بھی کچن میں دودھ نکل آتا ہے' مگر میرے بچے کے لئے ؟

مُنکی رک گئی' اُس نے ایک نظر مندر کی طرف جاتی ہوئی بھیڑ کو دیکھا' کچھ سوچا' اور پھر دھیرے سے اپنے گھر کی طرف مڑ گئی ——— !

●●
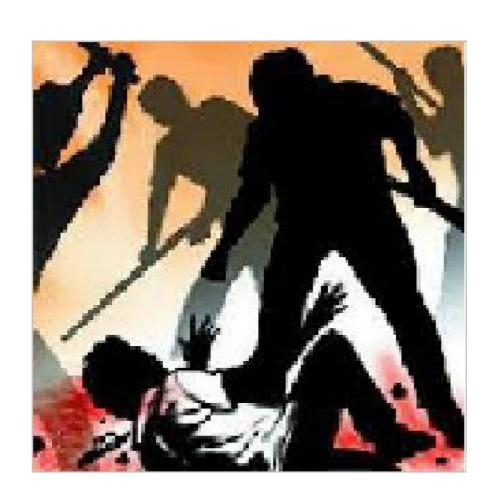
ٹھاکر بھی شیوخ کی طرح خود ہل نہیں جوتتے اور نہ مویشی چراتے ہیں۔ اس کے لئے "ہلواہے" اور "چرواہے" رکھے جاتے ہیں۔ ہلواہے زیادہ تر چمار ہوتے ہیں اور چرواہے اہیر۔ یہ گھر سے بھینس' گائیں ہنکا لے جاتے ہیں اور شام کو انہیں گاؤں کے اندرکرکے بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔ "ہلواہے" غریب دن بھر بیل کی طرح جوتے رہتے ہیں۔ وہی گھاس بھی کرتے ہیں' وہی کروی بھی کاٹتے ہیں اور وہی ناند اور گوبر بھی صاف کرتے ہیں۔ اندر باہر کے دوسرے کام کہار اور کھاریاں کرتی ہیں۔

(افسانہ "ہمارا گاؤں" علی عباس حسینی)

فصیلِ شب میں جاگتا ہے کوئی

غروب ہوتے ہوئے سورج کی زرنگار شعاعیں جب گاؤں کے خلط ملط مکانوں کی منڈیروں کو چومتے ہوئے مغرب کی سمت جھکنے لگیں اور کچھ ہی لمحوں میں نظروں سے اوجھل ہوگئیں تو خلاف دستور یکا یک فضا پر ایک دبیز اداس افسردہ سی کیفیت مسلط ہوگئی۔ اس وقت کارو مانجھی گاؤں کی اکلوتی چائے کی دکان سے اُٹھا اور گھر کی طرف آہستہ آہستہ قدم بڑھانے لگا۔ پیپل کے بوڑھے موٹے لمبے لمبے ریشوں والے پیڑ سے لاتعداد چڑیوں کی چہچہاہٹ سناٹے کو مزید بھیانک کر دیا تھا۔ کارو مانجھی چلتے چلتے سوچ رہا تھا—— ''آج فضا میں اتنی اداسی کیوں ہے اس سے پہلے تو اتنی اداسی نہیں دیکھی''

شام کی سرمئی دھند لکے میں کارو مانجھی اپنے گھر کے بند دروازے کو کھولا۔ گھر میں قدم رکھنے سے پہلے پلٹ کر باہر کی طرف دیکھا۔ باہر اُسی طرح اداسی پھیلی تھی۔ وہاں کوئی موجود نہ تھا۔ پھر ہولے سے دروازہ بند کیا اور صحن میں آ گیا۔ جیب سے ماچس نکال کر جلائی اور لالٹین کو روشن کر دیا۔ لالٹین کی مدھم روشنی صحن میں اس طرح پھیل گئی جیسی بھوکے آدمی کے پیٹ میں روٹی کے چند نوالے چلے گئے ہوں۔ کارو مانجھی نے لالٹین کے لوذرا دھیمی کر کے صحن میں ٹانگ دیا اور خود ہی بدبدایا——

''تیس روپئے لیٹر کراسن تیل بلیک میں خریدنا پڑ رہا ہے۔ دو دن میں ایک لیٹر تیل ختم ہو جاتا ہے۔ غریب آدمی کی زندگی کی طرح اسکے گھر میں بھی اندھکار ہی اندھکار گھستا جا رہا ہے۔ سولہ روپئے کیلو سبزی۔ چاول اور گیہوں کا دام بھی آسمان چھو رہا ہے۔ کس کس چیز کے لئے لڑائی لڑی جائے۔ ہر قدم پر ایک لڑائی۔ خاموش رہو تو کیڑے مکوڑے کی طرح مر جاؤ''۔

کارو مانجھی نے چٹائی بچھائی۔ مٹکے سے ایک لوٹا پانی نکالا۔ کڑھائی سے تھوڑی سبزی اور دو تین روٹیاں ایک پلیٹ میں نکال کر کھانے کے لئے بیٹھ گیا۔ وہ دن بھر میں ایک ہی بار کھانا بناتا تھا اگر دوپہر میں بنالیا تو وہی رات میں بھی کھالیا اور اگر رات میں پکایا تو دوپہر میں کھالیا۔ گھر میں تھا ہی کون۔ تن تنہا کارو مانجھی۔ پتنی تھی جو دو سال قبل ایک موذی مرض میں گرفتار ہوئی اور بالآخر موت کے منہ میں چلی گئی۔ کارو مانجھی کے پاس اتنا روپیہ نہیں تھا کہ بہتر ڈھنگ سے اسکا علاج کرا پاتا سرکاری اسپتال سے جو دوائیاں مفت میں ملتیں اُسی پر اکتفا کرنا پڑا لیکن وہ دوائیں اسکی پتنی بدھنی کے لئے ناکافی تھیں۔ کارو مانجھی کی جب شادی ہوئی تھی دوسرے سال ہی بدھنی نے ایک مریل سے بچّہ کو جنم دیا تھا۔ جو ایک ہفتہ کے بعد ہی مر گیا۔ دو سال کے بعد ایک بچّی کو پیدا کیا جو ایک سال کے اندر ہی مر گئی۔ پھر اسکی کوکھ نے کسی گربھ کو

سویکار نہ کیا۔

کارو مانجھی اور بدھنی محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتے رہے لیکن ایک دن کھیت مالک نے اسکی پندرہ دن کی مزدوری دینے سے انکار کر دیا تھا۔ تب کارو مانجھی کو بہت غصّہ آیا تھا اور اس نے مالک کو ایک زوردار طمانچہ یوں رسید کیا تھا کہ پاس کھڑے لوگوں کے ہاتھ آپ ہی آپ گالوں کو سہلانے لگے تھے۔ لوگ دنگ رہ گئے تھے کہ یہ کیا ہو گیا لوگ انجام سے باخبر تھے اور وہی ہوا۔ اسے پولس کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ لیکن پارٹی والوں نے دوڑ دھوپ کر کے اُسے چھڑا لیا تھا۔ اس دن سے وہ پارٹی کا وفادار ممبر بن گیا تھا۔

جاڑے کی سرد رات۔ رات ہوتے ہی سردی بڑھنے لگی تھی۔ کارو مانجھی ابھی بستر پر دراز ہی ہوا تھا کہ اس نے دروازے پر دستک سنی۔ وہ چونک پڑا۔ اتنی رات گئے کون ہو سکتا ہے۔ اس نے کہا —— ''کون ہے؟''

''میں ہوں ساتھی'' —— کوئی نسوانی آواز کارو مانجھی کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ بجلی کی تیزی سے اُٹھا اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ سامنے کامریڈ V کھڑی تھی۔ وہ فوجی لباس میں تھی۔ ہاتھ میں بندوق۔ کمر میں گولی کی پٹی اور کندھے پر ایک تھیلہ۔ وہ بغیر کچھ کہے اندر آ گئی۔ کارو مانجھی نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا ——

''کامریڈ آپ اس وقت۔ کہاں سے آ رہی ہیں؟'' —— کارو مانجھی کو توقع نہ تھی کہ کامریڈ V اسکے گھر بھی آ سکتی ہے۔ اس نے اسے ایک دو بار پارٹی کی میٹنگ میں دیکھا تھا۔ ایک بار وہ گاؤں میں بھی آئی تھی لیکن اسکے گھر پہلی بار آئی تھی۔

''ساتھی کچھ کھانے کے لئے ہے تو دے دیجئے نہیں تو ایک لوٹا پانی ہی پلا دیجئے''۔ —— کامریڈ V نے گھر کا معائنہ کیا۔

''کامریڈ دوپہر کا کھانا ہے میں نے کچھ دیر قبل ہی کھایا ہے۔ چار پانچ روٹیاں اور سبزی بچی ہے۔ اگر آپ کہیں تو لائیں۔''

''بے جھجھک لایئے۔ کرانتی کی اس لڑائی میں جو کھانے کو مل جائے غنیمت ہے۔''

کارو مانجھی المونیم کے ایک پلیٹ میں سبزی اور روٹی پروس کر لے آیا۔ ایک لوٹا پانی بھی لا کر رکھ دیا۔ وہ کھانے میں مشغول ہو گئی۔ کارو مانجھی چٹائی پر بیٹھ گیا۔

''ساتھی آپ کھاٹ پر بیٹھئے نیچے کیوں بیٹھ گئے۔''

''نہیں کامریڈ میں یہاں ٹھیک ہوں۔ آپ کھانا کھایئے۔''

''یہ ٹھیک نہیں غلط ہے۔ میں بھی چٹائی پر ہی بیٹھ جاتی ہوں۔'' —— کامریڈ V کھاٹ سے اُٹھ کر چٹائی پر بیٹھ گئی اور کھانا کھانے لگی۔

کھانے سے فارغ ہو کر جب کامریڈ V ہاتھ دھو کر پھر سے چٹائی پر آ کر بیٹھ گئی تو کارو مانجھی نے پلیٹ اور لوٹا کو سمیٹتے ہوئے کہا ——

''کامریڈ آپ تھوڑی دیر آرام کر لیں۔ میں جاگتا ہوں۔''

''نہیں ساتھی مجھے یہاں بس چار گھنٹے رکنا ہے۔'' —— اس نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھتے ہوئے کہا ——

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے کامریڈ آپ جاگتی رہیں اور میں سو جاؤں۔ میں بھی آپ کے ساتھ جاگتا رہوں گا''۔

کچھ دیر خاموشی پھیلی رہی کارو مانجھی کامریڈ V کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے اسکا وہ بھاشن یاد آ گیا جو اس نے پارٹی کی ایک میٹنگ میں دی تھی ——

''ساتھیو!

آپ کو پتہ ہے ہمیں کرانتی کے ذریعہ مچی تباہی کے لئے قصوروار ٹھہرایا جاتا ہے اور یہ الزام لگانے والے کون ہیں۔ برژوا ورگ کے لوگ۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ جب وہ کسی پر ظلم کرتے ہیں تو ان کا انصاف کہاں چلا جاتا ہے۔ آج جب مزدور، کسان اور غریب اس برژوا ورگ کے خلاف کرانتی کی مشعل روشن کرر ہا ہے تو یہ آتنک ہو گیا۔ ہمیں یہ مان لینا چاہئے کہ شوسکوں کو کچلے بغیر کوئی کرانتی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ جب ہم مزدوروں اور محنت کش کسانوں نے کرانتی کا جھنڈا اُٹھالیا ہے تو اس بات کا پختہ ارادہ کرنا ہوگا کہ شوسکوں کے پرتی رودھ کو کچل دینا ہمارا کرتبیہ بن گیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ سماج وادی کرانتی کا برژوا ورگ کے ذریعہ پرتی رودھ پورے ملک میں ہو رہا ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ اس کرانتی کے بڑھنے کے ساتھ پرتی رودھ بھی بڑھتا جائے گا۔ سروہارا اس پرتی رودھ کو کچل دے گا۔ پرتی رودھ کاری برژوا ورگ کے خلاف اس سنگھرش کے دوران ہمارے کرانتی کاری ساتھیوں کے حوصلے اور بھی بلند ہوں گے اور ہم محنت کشوں، مزدوروں اور کسانوں کی سرکار بنانے کی دشا میں آگے بڑھیں گے۔''

دن چڑھے جب کارو مانجھی کی آنکھ کھلی تو وہ بے حد تھکن محسوس کرر ہا تھا۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں اور پاؤں یوں محسوس ہو رہے تھے گویا من من بھر کے ہو گئے ہیں۔ وہ جیسے تیسے منہ ہاتھ دھوکر چائے خانہ میں آ گیا۔ پاؤں سمیٹ کر ایک ٹوٹی ہوئی بینچ کے ایک کنارے پر بیٹھتے ہوئے ایک پیالی چائے کی فرمائش کردی۔ وہاں گاؤں کے کئی لوگ اور بھی چائے پینے میں مصروف تھے۔ بنسی ماسٹر کا بیٹا راکیش نے اپنی موٹر سائیکل چائے خانہ کے باہر اسٹینڈ کی اور دندناتا ہوا اندر آ گیا۔ اس نے اپنے دوست موہن کو وہاں بیٹھا دیکھ کر ہی بائیک روکی تھی ——

''کیا بات ہے راکیش بہت گھبرائے ہوئے ہو'' —— موہن نے چائے کا گلاس اُٹھاتے ہوئے پوچھا جو اسکی طرف ہی بڑھ رہا تھا۔ راکیش اسکے سامنے والی بینچ پر بیٹھ گیا۔''

''تم کو پتہ ہے۔ رات شہر میں کیا ہوا؟''

''نہیں............ میں تو ادھر کئی دنوں سے شہر گیا بھی نہیں ہوں'' —— اس نے راکیش کے لئے بھی ایک چائے کا آرڈر دے دیا۔

''کل رات نکسلیوں نے شہر پر ہلّا بول دیا۔ وہ جیل توڑ کر اپنے کئی ساتھیو کو چھڑا کر لے گئے۔''

کارو مانجھی کے ساتھ ساتھ وہاں بیٹھے تمام لوگوں نے تجسس بھری نگاہوں سے راکیش کو دیکھا۔

''بھئی یہ تو انرتھ ہو گیا۔ ہم کو لگتا ہے کل کو ودھان سبھا پر بھی نکسلی قبضہ کر لیں گے'' —— بنواری چاچا نے تشویش ظاہر کی۔

''اب تو کچھ بھی ہو سکتا ہے چاچا۔ نکسلیوں کے حوصلے اتنے بلند ہیں کہ کچھ بھی کر سکتے ہیں'' —— راکیش نے بھی چنتا جتائی۔

''لیکن سرکار ان پر لگام کیوں نہیں کستی۔ پنجاب اور کشمیر سے آتنک واد جب ختم ہوسکتا ہے تو بہار سے کیوں نہیں''——موتی لال بھی بولنے سے نہیں چوکے۔

''یہاں بہت مشکل ہے چاچا۔ کیوں کہ دن میں کھیت مزدوری کرنے والا رات میں فوجی لباس پہن کر نکسلی بن جاتا ہے۔ پولس اسکی پہچان کیسے کرے گی۔ معاف کیجئے گا، ممکن ہے یہاں پر جتنے لوگ بیٹھے ہیں ان میں سے ہی کوئی نکسلی ہو ہم، آپ...... یہ...... وہ......آپ ہی بتایئے کیا اسکی کوئی پہچان ہے''——موہن نے سب کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھا۔

''یہ بات تو ٹھیک ہے پھر بھی سرکار کو کوئی نہ کوئی اُچت قدم اُٹھانا چاہئے''——راکیش بنواری چاچا کی طرف دیکھ کر بولا۔

''دیکھئے اب سرکار کون سا قدم اُٹھاتی ہے۔ بنواری چاچا بولے۔

''اب اس راجیہ کا بھگوان ہی مالک ہے۔''——موتی لال اُٹھتے ہوئے بولا۔ اس کے ساتھ کارو مانجھی بھی کھڑا ہو گیا۔ راکیش مزید جانکاری گاؤں والوں کو دیتا رہا۔

چائے خانہ سے نکل کر کارو مانجھی گھر کی طرف بڑھا تو اسکے ذہن میں شہر کا وہ واقعہ نقش ہو گیا تھا۔ وہ اپنے تصور میں پورا واقعہ لمحہ لمحہ بن رہا تھا۔

وقت بوند بوند کر گزرتا ہے۔ آفتاب کہیں ڈوب گیا ہے۔ دھندلکا پھیل رہا ہے۔ آس پاس کی چیزیں رفتہ رفتہ آنکھوں سے اوجھل ہونا شروع ہو گئی ہیں۔ کارو مانجھی کا کمرہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس کا ذہن بار بار کامریڈ V کی طرف چلا جاتا ہے۔ آج ایسی عورتیں کتنی ہیں جو کرانتی کی مشعل لے کر آگے آگے چلیں۔ کسی مہم کی کمانڈنگ کریں اور غریبوں، کسانوں کے حق کے لئے لڑیں''——پارٹی کے تئیں اسکا حوصلہ اور بلند ہو گیا۔

ابھی سورج نمودار بھی نہیں ہوا تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ کارو مانجھی اُٹھا اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے پولس کھڑی تھی۔ کارو مانجھی کو دیکھتے ہی پولس نے بندوق تان دی اور دوسرے پولس والوں نے لپک کر اسے اپنی گرفت میں لے لیا اور ہتھکڑی پہنا دی۔

''بھئی مجھے گرفتار کیوں کر رہے ہو۔ میرا قصور کیا ہے''

''تھانے چل سالے سب پتہ چل جائے گا''——انسپکٹر نے چلاّ کر کہا۔

گاؤں والے حیران تھے کہ کارو مانجھی کو پولس کیوں لے گئی، لیکن گاؤں میں موجود پارٹی کے ممبروں نے کارو مانجھی کی گرفتاری کی خبر پارٹی کے عہدیداروں تک پہنچا دی تھی۔

تھانے لا کر پولس نے کارو مانجھی کو بے تحاشہ مارنا شروع کیا۔

''بتا شہر میں جو نکسلی حملہ ہوا تھا اس میں کون کون لوگ تھے اسکو کمان کون کر رہا تھا''

لیکن کارو مانجھی کو خود پتہ نہ تھا کہ شہر پر جو حملہ ہوا تھا اس میں کون کون لوگ تھے۔ وہ بار بار انکار کرتا رہا اور پولس پیٹتی رہی۔

جب پولس مار کر تھک گئی تو انسپکٹر نے کہا ـــــــ

’’کل اسے عدالت میں حاضر کرو اور جیل بھیج دو۔‘‘

کارو مانجھی درد کی ٹیس کے باوجود مسکرایا اور بولا ـــــــ

’’کون سا جیل انسپکٹر، پھر کوئی جیل بریک آپریشن ہوگا اور مجھ جیسے بے قصور رہا کرا لئے جائیں گے تو آپ کیا کیجئے گا۔‘‘

انسپکٹر نے غصے میں بڑھ کر اسے ایک لات ماری اور باہر نکل گیا۔

●●

موٹر کے پاس پہنچ کر پنڈت نے آگے بڑھ کر اس کا دروازہ کھولا۔ پہلے پتلون پوش پھر رام دئی اور اس کے بعد دوسرا نوجوان موٹر میں داخل ہو گئے۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے موٹر چلی اور نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اور ہم آنکھیں جھپکتے رہ گئے۔

"شیطان' مردود!!" کالو نے بڑے اضطراب سے یہ دو لفظ ادا کئے۔

اتنے میں پنڈت آگیا اور ہم کو مضطرب دیکھ کر ایک مصنوعی آواز میں کہنے لگا —"میں نے ان سے دریافت کیا ہے۔ کوئی بات نہیں۔ وہ لڑکی کو ذرا موٹر کی سیر کرانا چاہتے تھے۔ انسپکٹر صاحب کے مہمان ہیں اور ڈاک بنگلے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ تھوڑی دور جاکر اسے چھوڑ دیں گے— امیر آدمی ہیں۔ ان کے شغل اسی قسم کے ہوتے ہیں۔"

(افسانہ "شغل" سعادت حسن منٹو)

پناہ گاہ

نہ جانے کہاں سے لکھمنیا کی ریگستان کی طرح خشک آنکھوں میں پانیوں کا سیلاب اُمڈ آیا۔اس کا دل بھر آیا۔اُس نے اپنی چھ سالہ بیٹی سمتا کو زور سے بھینچ لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔سمتا بھی ماں کو روتا دیکھ کر بلک پڑی۔بیٹی کو بلکتا دیکھ کر لکھمنیا نے اُسے خود سے الگ کیا۔۔۔۔۔۔

''ہمرا مقدر ہی خراب ہے بیٹی۔ہم بڑی بدنسیب ہیں''۔۔۔۔۔۔ آواز گلے میں پھنسنے لگی۔۔۔۔۔۔ '' ہملوگوں کا ایک ہی سہارا تھا۔وہ بھی چھن گیا۔ہم بے سہارا ہو گئے اور توانا تھ''۔۔۔۔۔۔ لکھمنیا نے آنچل سے آنسو خشک کئے پھر سمتا کے آنسو پوچھنے لگی اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔۔۔۔۔۔دکھوں کا سمندر کتنا گہرا کتنا وسیع ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔ ''ہے بھگوان میرا گناہ کیا تھا جو اتنی بڑی سزا دی۔ہم ماں بیٹی کے لئے روٹی پیدا کرنے والے کو ہی اُٹھا لیا''۔

لکھمنیا کا پتی ہزاریکا کو مرے آج تیسرا دن تھا۔لکھمنیا تین دن سے رہ رہ کر رو رہی تھی۔کبھی اُسکے آنسو خشک ہو جاتے تو کبھی جھرنوں کی طرح بہنے لگتے۔نہ اُسے کھانے کی سدھ تھی نہ پینے کی لیکن سمتا کی بھوک کا جب اُسے احساس ہوتا۔گھر میں بچا کچا کھانا اسے کھلا دیتی۔گھر کیا تھا ایک جھونپڑی تھی جس میں بس تین جون کسی طرح پیر پسار کر سو سکتے تھے۔جھونپڑی سے لگی ہی ایک چھوٹی سی دکان تھی۔جس کا منہہ سڑک کی طرف کھلتا تھا۔دکان کی چھت بھی پھوس ہی کی تھی۔جب ہزاریکا زندہ تھا تو اسی دکان میں چائے اور پکوڑے بیچتا تھا۔دکان اور مکان کے درمیان میں ٹاٹ کا ایک پردہ تھا جو دونوں کو دو حصےّ میں تقسیم کرتا تھا۔لکھمنیا جھونپڑی کے اندر بیٹھ کر پیاز کاٹتی یا بیسن گھولتی۔ہزاریکا پکوڑے تلتا، چائے بناتا اور اکیلئے ہی گاہکوں کو بڑھاتا۔دکان کا سارا کام وہ تقریباً اکیلے ہی کرتا۔چائے بنانا، پکوڑے تلنا، گاہکوں کو پانی بڑھانا یا جوٹھے برتن اُٹھانا۔البتہ لکھمنیا جوٹھے برتن کو دھو کر دکان میں بھیجوا دیتی۔ہزاریکا، لکھمنیا کو دکان میں اس لئے آنے سے منع کر دیا تھا کہ پتا نہیں کس گاہک کی نظر کیسی ہو۔کبھی کوئی فقرہ ہی کس دے یا بری نظر سے دیکھ ہی لے۔

دُکان سے اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ تینوں جون کا گزارہ آرام سے ہو جاتا تھا لیکن اتنا پیسہ نہیں بچتا تھا کہ پیٹ کے جہنم کو بجھانے یا تن کو ڈھانپنے کے علاوہ کچھ اور سوچ سکے۔تین روپیہ تو اُسے روز سرکاری سوچالیہ میں دینے پڑتے تھے۔اسکی دکان شہر کے بزازہ روڈ میں بھیڑ بھاڑ والے علاقے میں تھی۔جہاں تھانے والے کو کچھ پیسے دے کر روڈ کے کنارے جھونپڑی ڈال لی تھی۔تھانے میں دو یا تین بار پانچ چھ کپ چائے مفت میں بھیجوانی پڑتی تا کہ کوئی سپاہی آ کر اسے پریشان نہ کرے۔۔۔۔۔۔البتہ دو موسموں میں ہزاریکا کی پریشانی میں اضافہ ہو جاتا۔سردی کے

موسم میں جب کڑاکے کی سردی پڑتی۔ اسکے پاس نہ کوئی لحاف تھا اور نہ کوئی گرم چادر۔ پوال کو زمین پر ڈال کر اس پر بورے کا بستر بنا دیتا اور ایک بوسیدہ کمبل میں پتی پتنی اور بیٹی تینوں تن کو ڈھکے رہتے۔ لکھمنیا بیچ میں سوتی اس لئے کبھی وہ سمتا کو کمبل سے ڈھا کتی رہتی تو کبھی ہزاریکا کو۔ کہرے یا بارش والی رات میں یہ کمبل نا کافی ہوتا۔ ایسی صورت میں قریب کے پھل کی دکان سے ٹوٹے بکسے کی لکڑی مانگ کر لے آتا۔ اسی کا الاؤ جلاتا اور رات بھر تینوں تاپتے رہتے لیکن برسات کے موسم میں پریشانی میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ پھوس کی چھت سے ٹپ ٹپ پانی ٹپکتا رہتا۔ ایسی راتوں میں تینوں افراد آنکھوں میں رات کاٹتے۔ رات بھر جہاں جہاں سے پانی ٹپکتا وہاں وہاں المونیم کے برتن رکھ کر کچے فرش کو گیلا ہونے سے بچانے کی ناکام کوشش کرتے مگر بے تحاشہ پانی ٹپکنے سے پورا فرش گیلا ہو جاتا اور کہیں پر بھی سونے کی کیا بیٹھنے کی بھی جگہ نہ ہوتی۔ اس وقت لکھمنیا اپنی قسمت کو کوستی کہ سارے دکھ ہم غریبوں کے ہی قسمت میں کیوں لکھ دیا گیا ہے۔ رات میں سکون سے سو بھی نہیں سکتے۔ اسے اپنی یا اپنے پتی کی فکر تو کم ہوتی کیوں کہ دونوں کو دکھ جھیلنے کی عادت سی ہو گئی تھی مگر سمتا کی چنتا اُسے زیادہ ستاتی جب وہ اسکی نیند سے بوجھل آنکھوں میں دیکھتی تو اسکا دل تڑپ اُٹھتا۔ وہ تڑپ کر سمتا کو سینے سے لگا لیتی اور گود میں سلانے کی کوشش کرتی مگر چھت سے ٹپکتے پانی کی وجہ کر اسکی نیند میں بھی خلل پڑ جاتا۔

ہزاریکا کی موت نے لکھمنیا کی زندگی میں مشکلات کا پہاڑ کھڑا کر دیا تھا۔ سب سے بڑا مسلۂ پیٹ کے تندور کو ٹھنڈا کرنے کا تھا۔ ہزاریکا زندہ تھا تو دن بھر چائے کی دکان میں سخت محنت کر کے اتنا پیسہ کما لیتا تھا کہ تینوں جون کا پیٹ بھر سکے اور تن ڈھک سکے۔ اب لکھمنیا کے سامنے دو وقت کی روٹی کا انتظام بھی مشکل ہو گیا تھا۔ یہ سوچ کر اس کا دل بے قرا ہو اُٹھتا۔ دل کے ویرانے میں دور دور تک دھول ہی دھول اُڑنے لگتی ہے۔ گرم اور سیاہ دھول، کہیں یہ سیاہ بگولہ کسی دن اُسے بھی اپنے ساتھ نہ اُڑا لے جائے ———

''ہے بھگوان ہم کا کریں...... کہاں جائیں'' ——— لکھمنیا رو پڑتی ہے۔ ——— '' تم ہم لوگوں کو کیوں چھوڑ کر چلے گئے ہزاریکے...... ہمرا اب کوئی دھیان دینے والا نہیں۔ ہم اس جالم دنیا سے اکیلے کہاں تک لڑ سکیں گے...... کب تک مقابلہ کر سکیں گے۔ مرد کے بنا عورت کا جینا دوبھر ہو جاتا ہے......'' وہ روتی رہی سسکتی رہی اور اس مسئلے کا حل تلاش کرتی رہی۔ بہت سوچ وچار اور غور و خوص کے بعد بالآخر وہ ایک نتیجے پر پہنچ گئی۔

دوسرے دن چائے کی دکان کے چولہے سے دھواں اُٹھنے لگا تھا۔ لکھمنیا نے ساڑی کے پلو سے اپنے پورے چہرے کو ڈھک رکھا تھا۔ کام کرتے وقت ایک ہاتھ سے آنچل پکڑ کر کام کرتی ——— جب چولہے میں آگ روشن ہو گئی تو اس پر دودھ گرم کرنے کے لئے چڑھا دیا اور برتن کو صاف کرنے لگی۔ تھوڑی دیر میں ہی چائے بن کر تیار تھی۔ دکان کھلی دیکھ کا اکّا دکّا گاہکوں کا آنا شروع ہو گیا تھا۔ لکھمنیا چائے بناتی۔ پکوڑے چھانتی اور سمتا گاہکوں کو پکوڑے اور چائے بڑھاتی۔ پانی بڑھاتی اور جوٹھے برتن اُٹھا کر اُسے صاف کرتی۔ دو چار دن تو لکھمنیا کو بڑا عجیب سا لگا لیکن پیٹ کا جہنم جب اپنا شعلہ اگلتا تو شرم وحیا اس آگ پر غالب آجاتی۔ ایک دو دن اُسے کئی طرح کی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کوئی گاہک کم شکر کی چائے مانگتا، کوئی بغیر شکر کی، کوئی کڑک چائے۔ کبھی کبھی وہ جھنجھلا جاتی۔ اس طرح کام کرنے کی اسے عادت نہ تھی۔ پھر کبھی پکوڑے جل جاتے، کبھی کچے رہ جاتے۔ لیکن دھیرے دھیرے اُسے سب کرنے کی عادت ہو گئی۔

فرصت کے اوقات میں لکھمنیا سمتا کی خوب سیوا کرتی۔ اپنے ہاتھوں سے نہاتی اسکے بالوں کو سنوارتی، کھانا کھلاتی اور دل کھول کر پیار کرتی۔ وہ اسکے پیار میں اس طرح کھو جاتی جیسے اب وہی اسکی زندگی کا سرمایہ ہے لیکن سمتا کی بڑھتی عمر کو دیکھ کر وہ اندر سے پریشان ہو جاتی۔ دکان میں اوباش قسم کے لڑکے جو چائے پینے کے لئے آتے وہ سمتا کو ہوسناک نگاہوں سے نہارتے رہتے۔ کوئی پانی کا گلاس لینے کے بہانے سے اسکا ہاتھ پکڑ لیتا۔ کوئی گال میں چٹکی کاٹ لیتا کوئی گندے فقرے اُچھالتا، کوئی گانا گاتا ــــــ ''آتی کیا کھنڈالا۔''

لکھمنیا خاموشی سے سب دیکھتی رہتی اور خون کے گھونٹ پیتی رہتی۔ وہ کسی کو کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ عورت ذات وہ بھی اکیلی۔ کس کس سے جھگڑا کرتی۔ اوباش لڑکے کچھ بھی کر سکتے تھے۔ رات میں لکھمنیا اپنی چھوٹی سی تاریک جھونپڑی میں دروازہ بند کر کے چپ چاپ فرش پر لیٹ جاتی۔ اب اُسے ہر لمحہ سمتا کی فکر ستاتی رہتی۔ اسکی عزت کا خیال دامن گیر رہتا۔ وہ بڑی ہونے لگی تھی۔ چائے کی دکان پر ہر طرح کے لوگ چائے پینے آتے تھے۔ کسی کی بُری نظر کو' کسی کی نیت کو پہچاننا آسان نہیں تھا۔ اگر کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو وہ اپنے سور گییے پتی کو بھگوان کے یہاں کیا منہ دکھائے گی۔ سمتا کو وہ کسی بھی طرح دکان سے دور رکھنا چاہتی تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ سمتا اسکے بغل میں گہری نیند سو رہی تھی۔ اس نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے سمتا کے سر کو سہلایا۔ کتنی محبت اور کتنی مصیبتوں سے وہ اسکی پرورش کر رہی ہے۔ لکھمنیا کی آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ بہہ گیا۔ جوانی کا خنجر بھی بے سہارا عورت کو لہولہان کر دیتا ہے۔ آج ہزاریکا موجود ہوتا تو اسے سمتا کی اتنی فکر نہ ہوتی۔ وہ دُکان سنبھالتا اور لکھمنیا سمتا کی رکھوالی کرتی لیکن بیک وقت دکان اور سمتا کو سنبھالنا اسکے بس سے باہر تھا۔ تھوڑی دیر بعد لکھمنیا نے آنسو پوچھ لیے اور سمتا کی محفوظیت کے بارے میں سوچنے لگی۔

کچھ وقفے کے بعد وہ بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور ٹاٹ کا پردا ہٹا کر دکان میں آ گئی۔ چولہے میں ابھی بھی ہلکی ہلکی آنچ تھی سڑک پر آوارہ کتے بھونک رہے تھے۔ کبھی کبھی کسی سائیکل سوار یا رکشے کے گزرنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ ایک ٹیبل پر بیٹھ گئی۔ اسکی آنکھوں سے نیند کا چلمن اُٹھ چکا تھا۔ دل میں طرح طرح کے خیال اور سوال اُبھر رہے تھے۔ لکھمنیا کی آنکھوں میں گھوم پھر کر ایک ہی شخص کی تصویر بار بار اُبھر رہی تھی۔ وہ تھی ماسٹر صاحب کی ــــــ

اُن کا پورا نام رام پریکھا سنگھ تھا لیکن سبھی لوگ انہیں ماسٹر صاحب ہی کہہ کر پکارتے تھے۔ عمر کی پچاسویں سیڑھی پر قدم رکھ چکے تھے۔ ہائی اسکول میں حساب کے استاد تھے لیکن سائنس اور انگریزی کی بھی کلاس لیتے تھے۔ ویسے تو انکا پورا کنبہ پاس کے ہی ایک گاؤں سعدی پور میں رہتا تھا مگر ماسٹر صاحب کا شہر میں بھی ایک چھوٹا سا مکان تھا جہاں صبح و شام بچوں کو ٹیوشن پڑھاتے تھے۔ سنیچر کی شام کو وہ گاؤں چلے جاتے اور سمبار کی صبح میں واپس آ جاتے۔ ماسٹر صاحب اسکول جانے سے پہلے اور اسکول سے لوٹنے کے بعد ہزاریکا کی چائے دکان پر ضرور رکتے۔ چائے پیتے۔ ہزاریکا سے خیریت دریافت کرتے اور چلے جاتے۔ اسکی موت کے بعد بھی ماسٹر صاحب کے معمول میں کوئی کمی نہیں آئی تھی بلکہ لکھمنیا سے کچھ زیادہ ہی ہمدردی ہو گئی تھی۔ وہ اسکا ہر روز حوصلہ بڑھاتے۔ اسکی ہر ممکن مدد کرتے۔ لکھمنیا کو دوبارہ دکان کھولنے کے لئے ماسٹر صاحب نے ہی پانچ سو روپئے دیئے تھے۔ اس لئے لکھمنیا کی سوچ کا محور ماسٹر رام پریکھا سنگھ ہی تھے۔ اگر ماسٹر صاحب سمتا کو اپنی سرپرستی میں لے لیں تو وہ سمتا کی طرف سے اطمنان ہو جائے گی۔ جب وہ اس فیصلے پر پہنچتی ہے تو قدرے اطمنان محسوس کرتی ہے اور آہستہ سے آ کر بستر پر لیٹ جاتی ہے۔

دوسرے دن ماسٹر صاحب جب لکھمنیا کی دکان پر چائے پینے آئے تو وہ قدرے جھجھکتے ہوئی بولی——

''ماسٹر صاحب آپ سے ایک بات کہنی ہے؟''——اس وقت دکان میں اکّا دکّا گاہک ہی بیٹھ کر چائے پی رہے تھے۔ ماسٹر صاحب کو چائے کا گلاس سمتا پکڑا گئی تھی۔

''ہاں ہاں کہو''——ماسٹر صاحب ذرا سا سرک کر اسکے قریب آ گئے۔

''ماسٹر صاحب ہمکو ایک چنتا بہت ستا رہی ہے۔''----لکھمنیا نے دکان کے اندر دیکھا۔ دونوں گاہک آپسی گفتگو میں مہنمک تھے۔

کیسی چنتا لکھمنیا......بتاؤ......اگر ہمارے بس میں ہوگا تو ہم ضرور اُس چنتا کو دور کرنے کی کوشش کرینگے''——ماسٹر صاحب نے چائے کی ایک بڑی سی گھونٹ لی۔

''ماسٹر صاحب ہمکو سمتا کی چنتا ہے۔ وہ بڑی ہو رہی ہے۔ لچّے لفنگے لڑکے چائے پینے کے بہانے دکان میں آ کر اسے بُری نظر سے دیکھتے ہیں اور چھیڑتے ہیں''——لکھمنیا نے دھیمی آواز میں کہا۔ مگر سمتا جو اسکے پاس اب آ کر کھڑی ہو گئی تھی، اس نے ماں کی بات سن لی تھی۔ اس نے ایک نظر ماں کی طرف کی تو دوسری نظر ماسٹر صاحب پر ڈالی کہ اس وشے پر ماسٹر صاحب کیا بولتے ہیں۔ ماسٹر صاحب کچھ پل رُک کر بولے——

''یہ تو واقعی بہت چنتا کی بات ہے''——انھوں نے سمتا کی طرف دیکھا۔ واقعی وہ بڑی ہونے لگی تھی——پھر انھوں نے لکھمنیا کی طرف دیکھ کر کہا——''آخر تم نے اس سمسیا کا حل کچھ نہ کچھ تو سوچا ہوگا۔ تم بتاؤ تو میں بھی اپنا کچھ مشورہ دوں۔''

''ماسٹر صاحب ہمرے دماگ میں تو ایک ہی اُپائے ہے......وہ ای ہے کہ آپ سمتا کا اپنے اسکول میں نام لکھوا دیں تو دن بھر اسکول میں رہے گی دکان کے ماحول سے دور۔ اس کا سمے بھی کٹ جائے گا اور کچھ پڑھ لکھ بھی جائے گی۔''

ماسٹر صاحب کچھ دیر تک تمام پہلو پر غور کرنے لگتے ہیں۔ اس لئے خاموش ہو جاتے ہیں۔ لکھمنیا کو ماسٹر صاحب کے جواب کا انتظار تھا اور سمتا کو لگ رہا تھا کہیں ماسٹر صاحب منع نہ کر دیں۔ جب ماسٹر صاحب کافی دیر خاموش رہتے ہیں تو لکھمنیا پھر بولتی ہے——

''ماسٹر صاحب کا ای ممکن نہیں ہے۔''

ماسٹر صاحب ایک لمبی سانس لے کر پہلے لکھمنیا کو دیکھتے ہیں پھر سمتا کو——

''دیکھو لکھمنیا سمتا کی عمر اب بچوں والی نہیں رہی لیکن میرا ماننا ہے کہ پڑھنے لکھنے کی کوئی عمر نہیں ہوتی۔ سب سے پہلا مسئلہ تو اسکول میں داخلے کا ہے کہ اسے کس کلاس میں داخلہ کرایا جائے گا۔ پھر بھی میں کوشش کروں گا کہ اسکا داخلہ ہو جائے لیکن اسے بہت محنت کرنی پڑے گی تبھی جا کر اپنی عمر کے حساب سے کلاس پائے گی ورنہ چھوٹے بچوں میں بیٹھ کر پڑھنے سے احساس کمتری میں مبتلا ہو جائے گی۔''

''ماسٹر صاحب آپ چاہیں تو کچھ بھی ناممکن نہیں۔ گھر پر آپ بچوں کو ٹیوشن پڑھاتے ہیں اگر ایک گھنٹہ سمتا کو بھی سمے دے دیں تو وہ ضرور پڑھ لے گی۔ آپ کی جو فیس ہے......حالانکہ میں دینے کے لائق نہیں ہوں پھر بھی اپنا پیٹ کاٹ کر کچھ تو دے ہی دوں گی''۔

''پیسے کی کوئی بات نہیں ہے لکھمنیا میں پہلے ہیڈ ماسٹر صاحب سے بات کر کے دیکھتا ہوں۔ اگر وہ تیار ہو گئے تو کل ہی میں داخلہ کرا

دونگا‘‘ـــــــماسٹر صاحب نے چائے کا گلاس سمتا کو پکڑا دیا۔

’’ماسٹر صاحب گریب کی بیٹی ہے اگر کچھ پڑھ لکھ جائے گی تو میں دعا ہی دوں گی۔اس نے بیسن سے سنے دونوں ہاتھ جوڑ لئے۔

’’لکھمنیا میں ہر ممکن کوشش کروں گا سمتا پڑھ لکھ لے۔اچھا اب چلتا ہوں۔شام کو اسکے بارے میں بتاؤں گا۔‘‘

ماسٹر صاحب کے اشواسن سے لکھمنیا کو اطمنان ہو جاتا ہے۔لیکن سمتا کے چہرے پر پرسنتا کے پھول کھل جاتے ہیں۔سمتا چاہتی تھی کہ وہ بھی اسکول دیکھے، دوسرے بچوں کی طرح پڑھے لکھے۔اسکول کا یونیفورم پہنے اپنے کندھے پر اسکول کا بستہ اُٹھائے اور خوب دل لگا کر پڑھے۔ اس نے من ہی من میں سوچ لیا کہ وہ خوب دل لگا کر پڑھے گی اور اپنی عمر کی جماعت میں جلد پہنچ جائے گی۔

ماسٹر رام پریکھا سنگھ کی انتھک کوششوں سے سمتا کا داخلہ اسکول میں ہوگیا۔اب وہ اسکول جانے لگی۔ماسٹر صاحب اسکول جانے سے قبل جب لکھمنیا کی دکان پر چائے پینے آتے سمتا اسکول جانے کے لئے تیار ملتی۔وہ اسے ساتھ اسکول لے جاتے اور شام کو اسکول سے لوٹتے وقت چھوڑ جاتے۔سمتا کھا پی کر کچھ دیر کے بعد ماسٹر صاحب کے گھر چلی جاتی۔ماسٹر صاحب اسکول کا ہوم ورک کروا دیتے سبق بھی یاد کرا دیتے اور خود اُسے گھر تک چھوڑنے آتے۔

لکھمنیا اب خوش تھی کہ اسکی بیٹی محفوظ ہے۔صبح سے لے کر شام تک اس ماحول سے الگ رہتی ہے اس لئے اب کوئی اس پر بُری نظر بھی نہیں ڈالتا۔اوباش قسم کے لڑکے جو صرف سمتا کے لئے چائے پینے آتے تھے اب آنا بند کر دیا تھا۔سمتا کا دکان میں نہ رہنے سے لکھمنیا کے اوپر کام کا بوجھ بڑھ گیا تھا۔اب وہ چائے پکوڑے بھی بناتی۔گاہکوں کو بھی بڑھاتی برتن بھی صاف کرتی۔مگر اسکے چہرے پر ذرا بھی پریشانی کی لکیر نہیں اُبھرتی بلکہ خوشی کا تیج چمکتا نظر آتا کہ سمتا اب محفوظ ہے اگر وہ کچھ پڑھ لکھ جائے گی تو چائے کی دکان میں نہیں بیٹھے گی بلکہ کوئی اچھا کام کرے گی۔پڑھ لکھ جانے کی وجہ کر اسے اچھا ور بھی مل جائے گا۔

سورج ڈوب چکا ہے۔چاروں سمت دھندلکا دم بہ دم گہرا ہوتا جا رہا ہے۔لکھمنیا دکان بند کر کے آرام سے اپنے دونوں پاؤں پھیلائے بیٹھی ہے۔وہ بے فکر ہو کر اطمنان کی سانس لے رہی ہے۔اب اسکے سیاہ بالوں میں چاندی کے ایک دو تار نظر آنے لگے ہیں اور ادھر سمتا پر چپکے چپکے دبے پاؤں جوانی دستک دے رہی ہے۔سمتا کے جسم کے نقش ونگار اُبھر آئے ہیں۔اُسکے کانوں میں اب انجان سی سرگوشیاں سنائی دینے لگی ہیں۔ آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نمودار ہونے لگی ہے۔بدن سے باس اُٹھنے لگا ہے لیکن وہ پڑھنے لکھنے میں ذرا بھی غفلت نہیں برتتی ہے۔دل لگا کر محنت سے پڑھائی کرتی ہر روز ماں کو طرح طرح کی کہانیاں سناتی۔انگریزی کے الفاظ بولتی تو لکھمنیا آواک سی اسکا منہہ تکتی۔کبھی ہندی کے بھاری بھرکم الفاظ استعمال کرتی تو لکھمنیا کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا لیکن وہ دل ہی دل میں خوش ہوتی کہ اسکی بیٹی من لگا کر پڑھ رہی ہے اور ماسٹر صاحب کی بے حد شکور ہوتی کہ انہوں نے سمتا کو اس لائق بنا دیا کہ اسکے طور طریقے، بول چال، رہن سہن سب میں تبدیلی آ گئی ہے۔وہ بات بات پر ماں کو ٹوکتی کہ ماں ایسے بیٹھو، ایسے بولو، ایسے کھاؤ، لکھمنیا ہنس دیتی ـــــــ

’’بیٹی اب نہیں بدل سکتی۔بچپن سے ہمکو ایسا ہی سنسکار ملا ہے۔تو نئے زمانے کی پڑھی لکھی لڑکی ہے تیرے سنسکار بدل جائیں گے۔‘‘

’’سمتا تنک کر کہتی ـــــــ ماں سنسکار بدلنے کے لئے عمر کی کوئی سیما نہیں ہوتی۔مجھے دیکھو میں نے کتنی زیادہ عمر میں پڑھنا لکھنا شروع کیا

اور کتنی جلدی سب کچھ سیکھ گئی۔''

''لیکن بیٹی اس میں تیرے ماسٹر صاحب کا بڑا ہاتھ ہے۔جنہوں نے تجھے محنت سے پڑھایا،لکھایا اور تجھے اس قابل بنایا۔''——لکھمنیا کے چہرے سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔

''ماں واقعی ماسٹر صاحب بہت اچھے ہیں۔وہ اس طرح پڑھاتے ہیں کہ ہر بات دماغ میں کمپیوٹر کی طرح فٹ ہوجاتی ہے۔''——سمتا کے چہرے پر تیج تھا۔

''بھگوان کرے تو پڑھ لکھ کر کچھ بن جائے تو میری تپسیا پوری ہوجائے''۔

''ماں میں کچھ بن کر ضرور دیکھاؤں گی۔''——سمتا نے مٹھی باندھ کر ہوا میں لہرایا۔

''بھگوان کرے ایسا ہی ہو۔''——لکھمنیا اُٹھ کر بستر لگانے لگی۔

لکھمنیا اب بے حد خوش تھی کہ وہ سمتا کو چائے کی دکان کے ماحول سے الگ رکھ کر ایک اچھا شہری بنا رہی ہے۔لکھمنیا حسب اوقات اسکی ہر خواہش کی تکمیل کرتی۔کتاب،کاپی،کپڑا۔لیکن ماسٹر صاحب بھی کم مدد نہیں کرتے اچھی اچھی کتابیں خرید کر دیتے مہنگی کتابیں اپنے گھر سے دیتے۔کچھ کتابیں لائبریری سے دلوا دیتے۔اس طرح سمتا کے حصول تعلیم میں کوئی دشواری پیش نہیں آرہی تھی۔

لکھمنیا کئی دن سے دیکھ رہی تھی دو پولس والے اکثر رات میں اسکی دکان پر چائے پینے آتے اور کافی دیر تک کھڑے رہ کر ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہتے یہ دونوں قریب کے تھانے کے سپاہی تھے۔دونوں کی نظریں دکان کے اندر بنی جھونپڑی کی طرف ہوتی۔پہلے تو لکھمنیا سمجھ نہیں پائی کہ یہ پولس والے جھونپڑی کے اندر کیا تلاش کرتے ہیں لیکن آج تو حد ہوگئی۔چائے پینے کے درمیان دونوں پولس والے سرگوشی کے انداز میں باتیں کررہے تھے۔ایک پولس والا جھونپڑی کے اندر جھانکتے ہوئے دھیرے سے بولا——

''آج کل اسکی چھوکریا نظر نہیں آتی ہے۔لگتا ہے کسی دھندے پر لگا دیا ہے۔''

دوسرا پولس والا بھی اندر جھانکا——

''ارے یہ لوگ اور کس دھندے پر لگائے گی۔زیادہ پیسہ کمانے کا بس ایک ہی دھندا ہے۔''

''تو کا ہمکو بھی پیسہ دینا پڑیگا ہیرالال''

''نہیں بنسی تو بھی کا بات کرتا ہے۔اسکو دکان یہاں رکھنا ہے کہ نہیں۔رات میں گشت لگانے کے درمیان موقع دیکھتے ہی اندر گھس جائیں گے۔بس کام تمام''۔

دونوں پولس والے چائے پی کر وہاں سے چلے گئے۔لکھمنیا جوان لوگوں کی گفتگو پر ہی کان لگائے تھی جہاں تہاں سے کچھ الفاظ اسکی سمجھ میں آیا تھا مگر آخری جملہ چونکہ کچھ زور سے کہا گیا تھا اس لئے اس جملے کو سن کر اندر تک کانپ گئی۔بات اسکی سمجھ میں آگئی تھی کہ دونوں پولس والے سمتا کے بارے میں باتیں کررہے تھے اور دونوں کی نیت ٹھیک نہیں تھی۔یہ پولس والے کچھ بھی کرسکتے ہیں۔اگر کسی رات جھونپڑی کے اندر گھس گئے تو وہ اکیلی جان کیا کر پائے گی۔اسکی عزت تو جائے گی ہی سمتا کی بھی عزت لٹ جائے گی۔پولس والے کا خوف اسکے اندر سرایت کر گیا تھا۔وہ

سمتا کے تحفظ کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگی تھی سوچتے سوچتے بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ ماسٹر صاحب کا مکان ہی سب سے زیادہ محفوظ ہے۔ وہ ماسٹر صاحب کو کہے گی کہ سمتا کو اپنے گھر میں ہی کسی کونے میں جگہ دے دیں جہاں وہ رات گزار سکے۔ اُسے اب اپنے ساتھ رکھنا خطرے سے خالی نہیں ہے——یہ سوچ کر وہ قدرے اطمنان محسوس کرتی ہے چائے کی دکان جلدی جلدی بند کرتی ہے حالانکہ ابھی ساڑھے آٹھ ہی بجے تھے۔ روزانہ وہ نو بجے دکان بند کرتی تھی۔ سمتا کے آنے کا وقت بھی وہی تھا۔ وہ یہ سوچ کر دکان جلد بند کر دی کہ آج ہی سے وہ سمتا کو ماسٹر صاحب کے گھر میں رہنے کا انتظام کر دے گی۔ دکان بند کر کے وہ ماسٹر صاحب کے گھر کی طرف چل پڑی۔

ماسٹر صاحب کا گھر باہر سے کھلا ہوا تھا۔ لکھمنیا اندر داخل ہوگئی۔ صحن سے ہوتے ہوئے ماسٹر صاحب کے کمرہ تک وہ پہنچ گئی۔ کمرہ کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ اس نے پردہ ہٹا کر جیسے ہی کمرہ میں قدم رکھا اندر کا منظر دیکھ کر اس پر سکتہ طاری ہوگیا گویا کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ ذہن ماؤف اور ہاتھ پاؤں جیسے شل ہوگئے ہوں۔ اس نے دیکھا۔

سمتا اور ماسٹر صاحب ادھ ننگے ایک ہی بستر پر سوئے ایک الگ ہی پاٹھ پڑھ رہے تھے۔

●●
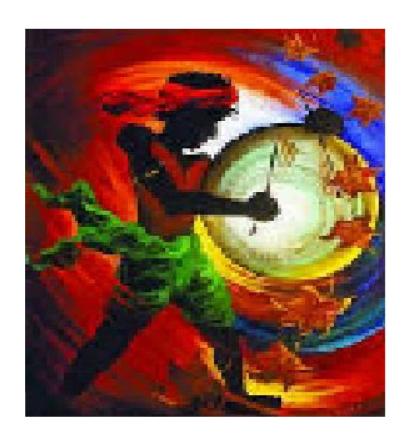
"مگر لونڈا تیرا نہیں رام اوتار.......... اس حرامی رتی رام کا ہے۔" ابا نے عاجز آکر سمجھایا۔

"تو کا ہوا سرکار..........میرا بھائی ہوتا ہے رتی رام کوئی گیر نہیں۔ اپنا ہی کھون ہے۔"

"نرا الّو کا پٹھا ہے۔" ابا بھنا اٹھے۔

"سرکار' لونڈا بڑا ہو جاوے گا۔ اپنا کام سمیٹے گا۔ رام اوتار نے گڑگڑاکر سمجھایا۔ وہ دو ہاتھ لگائے گا۔ سو اپنا بوڑھاپا تیر ہو جائے گا۔" ندامت سے رام اوتار کا سر جھک گیا۔

اور نہ جانے کیوں ایک دم رام اوتار کے ساتھ ابا کا سر بھی جھک گیا۔ جیسے ان کے ذہن پر لاکھوں کروڑوں ہاتھ چھا گئے.......... یہ ہاتھ حرامی ہیں نہ حلالی' یہ تو بس جیتے جاگتے ہاتھ ہیں ۔ جو دنیا کے چہرے سے غلاظت دھو رہے ہیں۔ اس کے بوڑھاپے کا بوجھ اٹھا رہے ہیں۔

یہ ننھے منے مٹی میں لتھڑے ہوئے سیاہ ہاتھ دھرتی کی مانگ میں سیندور سجا رہے ہیں۔

(افسانہ "دو ہاتھ" عصمت چغتائی)

شدّھی کرن

بوڑھے شجر پر صبح کی کرنیں جب پڑتیں، کرشنا چودھری کی آنکھوں میں ایک نئی چمک نمودار ہو جاتی۔ اسکی پلکوں پہ خوشی کے تارے جھلملانے لگتے۔ ایک خواب تھا جو برسوں سے اسکی آنکھیں دیکھتی آ رہی تھیں۔ خواب پہلے پہل دھندلا سا نظر آتا تھا لیکن جیسے جیسے اسکا بیٹا وکاس چودھری اپنی کلاس میں پڑھائی میں سبھی بچوں کو پیچھے چھوڑتا گیا اور ہمیشہ اوّل پوزیشن کو برقرار رکھا، کرشنا چودھری کے خواب کی بنیادیں پختہ ہوتی گئیں۔ لیکن اسکا گھر——؟ نہ پختہ دیواریں نہ پختہ چھت۔ صرف کچی دیواریں، جس پر بانس اور پھوس کے اوپر چھپر ڈال دیئے گئے تھے۔ اسکا آبائی پیشہ تاڑ سے تاڑی اتار کر فروخت کرنا تھا لیکن کرشنا چودھری نے یہ پیشہ ترک کر دیا تھا وہ ایک پرائمری اسکول میں ٹیچر ہو گیا تھا وہ چاہتا تھا اب اسکا بیٹا وکاس چودھری اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے بلند مقام تک پہنچے۔

دن ڈھلتا ہے تو رات آتی ہے جو تمام چھوٹے بڑے، کھرے کھوٹے، سچے جھوٹے انسانوں پر آرام کی، سکون کی چادر تان دیتی ہے جس میں انسان کچھ پل، کچھ لمحے، کچھ گھنٹے کے لئے اپنا سب کچھ بھول جاتا ہے اور رات کی تنی ہوئی چادر میں اپنے وجود کو اس طرح سمیٹ لیتا ہے کہ اسے پتہ بھی نہیں چلتا کہ کب صبح نمودار ہوگئی۔ صبح ہوتے ہی خلقت بیدار ہوتی ہے۔ کرشنا چودھری نے جب آنکھ کھولی تو آج کا اخبار اس کی آنکھوں کے سامنے تھا اپنے بیٹے وکاس چودھری کا رزلٹ دیکھا وہ اوّل پوزیشن سے دسویں کا امتحان پاس کیا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کو گلے سے لگایا۔

''بیٹے آج تم نے پہلی منزل طے کر لی ہے اگر اسی طرح آگے بڑھتے رہے تو میرا برسوں کا خواب پورا ہو جائے گا''—— کرشنا چودھری کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو لرز رہے تھے—— ''چل بیٹا مکھیا جی سے آشیرواد لے لے، گاؤں کے بزرگ آدمی ہیں۔''

گاؤں کا مکھیا ہریندر سنگھ آرام کرسی پر بیٹھا موبائل پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ ایک ہواری ان کا پیر دبا رہا تھا۔ کئی لوگ ان کے ارد گرد بیٹھے تھے۔ کرشنا چودھری اور وکاس ہاتھ جوڑ کر پرنام کرنے کے بعد کھڑے ہو گئے۔ جب بات ختم ہوگئی تو ہریندر سنگھ نے دونوں کی طرف دیکھا——

''کہو کرشنا چودھری کیسے ہو؟''

''بھگوان کی کرپا ہے؟''

''تمہارا بیٹا تو اب بڑا ہو گیا ہے کہیں کام وام پر لگا یا یا نہیں؟''—— ہریندر سنگھ نے وکاس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''نہیں مکھیا جی وکاس تو ابھی پڑھے گا۔ دسویں کا امتحان فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا ہے۔ اس لئے آپ کے پاس آشیرواد کے لئے لایا ہوں۔ آپ اسے آشیرواد دیجئے کہ پڑھ لکھ کر بڑا افسر بن سکے——''کرشنا چودھری کے چہرے پر خوشی ناچ رہی تھی۔

ہریندر سنگھ نے حقارت بھری نگاہ دونوں باپ بیٹے پر ڈالی پھر چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔

''ہاں بھئی سرکار نے تم لوگوں کو ریزرویشن دے رکھا ہے کہیں نہ کہیں تو لگ ہی جائے گا۔ جیسے ریزرویشن کا فائدہ اٹھا کر تم ٹیچر بن گئے میرا آشیرواد اسکے ساتھ ہے—— ہریندر سنگھ نے دور سے ہی ہاتھ اُٹھا کر آشیرواد دیا۔ وکاس کو بہت برا لگا کہ وہ پاس بلا کر سر پر ہاتھ رکھ کر بھی آشیرواد دے سکتے تھے۔ وہ دل ہی دل میں کسمسا کر رہ گیا۔ کرشنا چودھری کو بھی برا لگا وہ وکاس کو لے کر حویلی سے باہر آ گیا۔ ان کے جانے کے بعد ہریندر سنگھ نے زور سے قہقہہ لگا کر پاس بیٹھے لوگوں سے مخاطب ہوا۔

''کرشنا چودھری لاکھ ٹیچر بن جائے لیکن اُسکی آج بھی ہمت نہیں ہے کہ میرے سامنے بیٹھ سکے۔ آج بھی اُسی طرح کھڑا رہتا ہے۔ جس طرح اسکا باپ میرے پتا جی کے وقت میں کھڑا رہتا تھا۔ میں نے بھی اُسے بیٹھنے کے لئے نہیں کہا۔ نیچ ذات کا ہو کر میرے سامنے بیٹھے، میں کبھی برداشت نہیں کر سکتا وہ تو سرکار نے چھوٹ دے رکھی ہے نہیں تو حویلی کے اندر قدم رکھنے کی ہمت نہیں تھی۔ بڑا آیا بیٹا کو آفیسر بنانے والا جیسے ڈی۔ ایم۔، ایس۔ پی۔ بن جائے گا ارے بہت ہوگا تو کہیں کسی دفتر میں چپراسی وغیرہ بن جائے گا..... ہاہاہا.....''

کرشنا چودھری اور وکاس کے کانوں میں ہریندر سنگھ کی باتیں اس طرح سنائی دیں جیسے کسی نے پگھلا ہوا شیشہ کانوں میں ڈال دیا ہو۔ وکاس تلملا کر رہ گیا۔ اسکے دل میں آیا کہ لوٹ کر حویلی جائے اور ہریندر سنگھ کا کالر پکڑ کر اُٹھائے اور بولے—— ''ہریندر سنگھ تم لوگ ہم پر ہنس رہے ہو ایک دن ایس۔ پی۔ بن کر دکھاؤں گا''—— لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ کرشنا چودھری کے اندر بھی غصے کی ایک چنگاری اُبھری مگر جلد شانت ہو گئی۔

راستے میں گزرتے ہوئے گاؤں کا اکلوتا مندر ملا۔ کرشنا چودھری نے دور سے ہی بھگوان کو جھک کر ماتھا ٹیکا۔ وکاس چاہتا تھا کہ وہ اندر جا کر بھگوان کے چرن چھوئے مگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا پنڈت جو دروازے پر کھڑا تھا اس نے حقارت کی نگاہوں سے باپ بیٹے کو دیکھا۔ وکاس کو وہ دن یاد آ گیا جب وہ آٹھ سال کا تھا اور اپنے ہم جماعت بچوں کے ساتھ مندر کی سیڑھیوں پر کھیل رہا تھا تو اسی پجاری کے کہنے پر نہ صرف اسے اور اسکے دوستوں کو پیٹا گیا تھا بلکہ اس بات کو لے اس کے والدین اور برادری کے کئی لوگوں کو زدوکوب کیا گیا تھا۔ دونوں باپ بیٹا چلتے چلتے ندی کنارے آ گئے۔ ندی کے آس پاس کوئی نہ تھا وہ دونوں ایک پتھر پر بیٹھ گئے۔

''بیٹا ہم کتنے بدنصیب ہیں کہ مندر میں جا کر دو پھول نہیں چڑھا سکتے۔ بھگوان کے چرن نہیں چھو سکتے۔ تجھے بھگوان کا آشیرواد نہیں دلا سکتے''—— آنکھوں میں ٹھہرا ہوا درد پگھلتا ہے اور نمی بن کر کنارے پر ٹھہر جاتا ہے۔

''پتا جی اب زمانہ بدل رہا ہے، تھوڑا اور انتظار کیجئے بہت جلد سب کچھ بدل جائیگا۔ سکچھا آ جانے کے بعد یہ بھید بھاؤ خود بخود ختم ہو جائیگا۔''

''ہاں بیٹے مجھے بھی ایسا لگتا ہے۔اب تجھے آگے پڑھائی کے لئے شہر جانا ہے۔میں نے سارا انتظام کر دیا ہے۔تو صرف میرا نہیں بلکہ پوری برادری کا نام روشن کر کے دکھائے گا۔''

''پتا جی آپ کا سپنا ضرور پورا ہوگا۔ چلئے گھر چلتے ہیں۔''

آج پندرہ اگست تھا اسکول میں جھنڈا تولن ہونا تھا۔گاؤں کے مکھیا ابھی تک نہیں آئے تھے کافی دیر تک انتظار کے بعد بھی نہیں آئے تو وہاں موجود لوگوں نے کرشنا چودھری سے کہا——

''آپ ہی جھنڈا تولن کر دیجئے۔آپ اس اسکول کے سب سے سینئر ٹیچر ہیں۔''

''مکھیا جی کا تھوڑا اور انتظار کرنا چاہئے۔''——اس نے اپنی کلائی میں بندھی گھڑی کی طرف دیکھا۔

دس تو بج گئے آٹھ بجے کا سمے دیا تھا لگتا ہے مکھیا جی کسی دوسرے کام میں ویست ہیں۔''——ایک ٹیچر نے کہا۔

''ماسٹر صاحب اب مزید انتظار نہ کیجئے آپ جھنڈا تولن کیجئے۔''—— گاؤں کے ایک ضعیف نے زور دے کر کہا۔

کرشنا چودھری کچھ پل رکے پھر کچھ ہچکچاہٹ کے بعد آگے بڑھے ابھی وہ رسی پکڑ کر کھینچنے ہی والے تھے کہ ہریندر سنگھ کی گرج دار آواز اسکے کانوں سے ٹکرائی——

''کرشنا چودھری ٹھہر جاؤ''——وہ رک گیا۔ ہریندر سنگھ اسکے قریب آگئے اور حقارت بھری نظروں سے کرشنا چودھری کو دیکھا۔

''جھنڈا تولن کے لئے آگے بڑھنے کی تمہاری ہمت کیسے ہوئی؟''

''آپ نہیں آئے اور لوگوں نے اصرار کیا تو میں آگے بڑھ گیا۔''

''تمہاری اوقات نہیں ہے جھنڈا تولن کرنے کی آئندہ ایسی غلطی نہ کرنا۔ ہماری برادری کا ایک بچہ جھنڈا تولن کر سکتا ہے مگر تم نہیں کر سکتے''——ہریندر سنگھ کی آنکھوں میں غصّہ کی جوالا بھڑک رہی تھی۔

''کرشنا چودھری تلملا کر رہ گیا مگر خاموش رہا اُسے ایسا لگا کوئی اس پر بہت سارے پتھر برسا رہا ہے اور اسکا وجود لہولہان ہو کر زمین پر پڑا سسک رہا ہے۔

وقت ہر زخم بھر دیتا ہے لیکن جب بھی پندرہ اگست یا 26 جنوری آتا کرشنا چودھری کا زخم ہرا ہو جاتا۔لیکن وہ وقت کا انتظار کر رہا تھا کہ وقت ایسا طمانچہ مارتا ہے جس کا احساس انسان برسوں کرتا ہے اور ایسا ہی طمانچہ ہریندر سنگھ کو پڑا تھا۔ وکاس چودھری نے U.P.S.C. کا کمپٹیشن نکال لیا تھا اور ایس۔پی۔کی ٹریننگ لینے کے بعد اسی ریاست میں اس کی پوسٹنگ ہوگئی تھی۔کرشنا چودھری کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ وہ گاؤں میں مٹھائیاں بانٹ رہا تھا مگر ہریندر سنگھ کا چہرہ مرجھا گیا تھا۔

وکاس اپنے چیمبر میں بیٹھا فائل پڑھ رہا تھا کہ اسکے پی۔اے۔نے بتایا کہ کوئی پنڈت جی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔

''بھیج دو''——وکاس نے فائل پر دستخط کر کے دوسری طرف رکھا اور نظر اٹھا کر دیکھا ایک ادھیڑ عمر کا پنڈت چیمبر میں داخل ہوا۔

''آیوسمان بھوہ بالک.....''

''پنڈت جی کہئے کیا کام ہے؟''

وکاس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ رینگ گئی جس آشیرواد اور پرساد کے لئے برسوں ترستا رہا آج خود سے چل کر پنڈت جی اسکے چیمبر میں کھڑا تھا وہ اٹھا پنڈت جی کے پیر چھوئے پنڈت جی نے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

''سدا خوش رہا۔''

وکاس جب آشیرواد لے کر کھڑا ہوا تو پنڈت جی نے اسکے ماتھے پر تلک لگایا اور تھالی سے پرساد اٹھا کر وکاس کی طرف بڑھایا وکاس نے دونوں ہاتھوں کو کٹورا بنا کر پرساد لے کر منہ میں ڈالا اور سر پر ہاتھ پھیر لیا۔ اپنے پرس سے سوسو کے پانچ نوٹ نکال کر پنڈت جی کی تھالی میں رکھ دیا۔ پنڈت جی کا چہرہ کھل اُٹھا اور مزید آشیرواد دیتے ہوئے چیمبر سے باہر نکل گئے۔ پنڈت جی کے جانے کے بعد جیسے ہی اپنی کرسی پر بیٹھا موبائل کی گھنٹی بج اُٹھی اس نے موبائل اُٹھایا اسکے پتا جی کا فون تھا۔

''ہاں پتا جی بولئے سب کُشل منگل تو ہے۔''

''بیٹا سب ٹھیک ٹھاک ہے جیسا کہ تم جانتے ہو کہ گاؤں کی پرانی مندر کو توڑ کر نئی مندر بنائی گئی جس میں تم نے کافی سہیوگ کیا ہے اب وہ مندر بن کر تیار ہو گئی ہے 15 اکتوبر کو پوجا ارچنا کی جائیگی گاؤں کے لوگ چاہتے ہیں کہ مندر کا پٹ تمہارے ہاتھوں کھولا جائے تم ضرور آجانا مکھیا جی بھی یہی چاہتے ہیں۔''

''جی پتا جی ضرور آجاؤں گا آپ اطمینان رکھیں۔''

وکاس جب گاؤں پہنچا تو گاؤں کے لوگوں نے بڑے پُرتپاک انداز سے اس کا سواگت کیا۔ اس نے مندر کا ادگھاٹن کیا۔ پوجا ارچنا کی۔ مکھیا ہریندر سنگھ زبردستی اسے اپنے گھر لے گئے۔ کرسی پر بٹھا کر اپنے بیٹے سریندر کو بلایا۔

''وکاس بیٹے یہ میرا بیٹا سریندر سنگھ ہے۔ ٹھیکیداری کا کام شروع کیا ہے۔ دس لاکھ کا ایک ٹھیکے کا ٹنڈر بھرا ہے جو ڈی۔ ایم۔ صاحب کے ہاتھ میں ہے اگر تم پیروی کر دو تو ٹنڈر اسے مل جائیگا آخر تم پر ہمارا ابھی تو کوئی حق ہے۔

''کیوں نہیں۔ سریندر تم سارا ڈیٹیل لے کر میرے آفس آجانا میں ڈی۔ ایم۔ صاحب سے بات کروں گا۔''

''بیٹے بڑا احسان ہوگا میں ابھی سے تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں'' —— ہریندر سنگھ ہاتھ جوڑ دیتے ہیں۔

''آپ ہاتھ نہ جوڑیئے میرے پتا سمان ہیں میں یہ کام ضرور کر دوں گا۔''

''لو بیٹے چائے تو پیو۔ یہ بسکٹ لونا شہر سے آج ہی تمہارے لئے منگوایا ہے'' —— ہریندر سنگھ ناشتے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وکاس ایک بسکٹ اٹھا کر منہ میں ڈالتا ہے اور چائے کی پیالی اُٹھا لیتا ہے۔ چائے پینے کے بعد رخصت ہوتا ہے۔

''اچھا انکل اب چلتا ہوں۔''

''آج تو گاؤں میں رہو گے نا؟''

''نہیں انکل وہاں بہت کام ہے۔بس ماں پتا جی سے ملتا ہوا چلا جاؤں گا۔''

وکاس کی جیپ جب تیزی سے آگے بڑھ گئی تو ہریندر سنگھ نے حقارت بھری نظروں سے جاتے ہوئے وکاس کو دیکھا۔

''ایک ہریجن سے کام لینے کے لئے گھر پر بلانا پڑا اور اپنے سامنے بٹھانا پڑا.....ہریا.....ارے ہریا.....''

''جی مالک۔''

''یہ کپ اور ناشتہ کا سارا پلیٹ باہر جا کر بھینک دے اور اس کرسی کو صابن سے بڑھیا سے دھو کر لے آ۔''

''جی مالک ابھی دھوتا ہوں۔''——ہریا ناشتہ کا پلیٹ اور کپ سمیٹ کر باہر پھینک دیتا ہے اور کرسی کو دھونے کے لئے باغ کی دوسری طرف چلا جاتا ہے۔

وکاس کی جیپ اب گاؤں سے باہر نکل رہی تھی اس نے مندر کے کلش کو دیکھا جو دور سے چمک رہا تھا وہ دل ہی دل میں خوش تھا کہ آج اس نے مندر کا اُدگھاٹن کیا مندر کے اندر پوجا ارچنا کی لیکن اسے کیا پتہ کہ اس کے جانے کے بعد مندر کی دُھلائی شروع ہو گئی تھی۔گاؤں کا ایک آدمی جو پنڈت جی کے ساتھ مندر کی دھلائی کر رہا تھا پوچھا۔

''پنڈت جی یہ مندر کی دُھلائی کیوں کر رہے ہیں ابھی تو پوجا ہوئی ہے۔''

''تم نہیں سمجھو گے مندر کا شدّھی کرن کر رہا ہوں۔''

••

خیراتن اور اس کی بیٹی کو ان تینوں کے حال پر بڑا ترس آیا اور سب آٹا اٹھا کر یک مشت ان لوگوں کو دے دیا۔ عورت غریب ان آدمیوں سے خلاف توقع اتنا آٹا پا کر متعجب ہوئی مگر عورت تھی۔ ان عورتوں کے خلوص میں اس کو شک ہوا۔ ذرا دور گلی میں جا کر اس نے پوٹلی کھولی اور جب حقیقت معلوم ہوئی تو خوب بڑبڑائی، کوشنے دئیے اور آٹا گلی میں ڈال کر چلتی ہوئی۔ اس کو خراب آٹے کی کیا پرواہ تھی؟ اس کی جیب میں آج کی تحصیل وصول کے روپیہ کھنک رہے تھے۔

(افسانہ "ڈھائی سیر آٹا"، حیات اللہ انصاری)

بے پناہ جنگل، اور وجود

وہ ـــــ

سولہ سترہ برس کا گوراچٹا، کرنجی آنکھوں والا علی عباس!

درد کی شدت سے آنکھیں موند لیتا ہے ـــــ'

چند پرندوں کے زخمی پروں کی پھڑ پھڑاہٹ اُس کی سماعت سے ٹکراتی ہے۔ وہ کانپ جاتا ہے، دور دور تک گرد ہی گرد اور اُس میں گم ہوتی ہوئی چیخیں، کراہیں، گریہ وزاری ـــــ'

اُف! وہ اپنی آنکھیں کھول دیتا ہے اُس کا ذہن کسی بھی طرح اُس منظر کو پھر اپنی گرفت میں لانے سے باز رہنا چاہتا ہے لیکن لمحہ لمحہ اُس کی سوچ اُس دل خراش منظر کا تعاقب کرتی ہے اور لامحالہ اس کا ذہن اُدھر بھٹک جاتا ہے۔

باہر تاریک رات کے جسم پر کوئی دستک دے رہا ہے۔

''رات میں دروازہ مت کھولئے!'' ـــــ مولوی لیاقت علی کی بیوی آمنہ اپنے شوہر کو منع کرتی ہے۔

''ہوسکتا ہے کوئی شناسا ہو۔ باہر سرد رات میں ٹھٹھر کر رہ جائے گا'' مولوی لیاقت علی نے اپنی بیوی کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''نکسلائیٹ بھی تو ہو سکتے ہیں؟ ـــــ'' آمنہ کے چہرے پر خوف کے آثار تھے۔

''تمہیں تو ہر وقت نکسلائیٹ کا ہی ڈر لگا رہتا ہے'' ـــــ مولوی لیاقت علی اس کے شک کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

''آپ نے سنا نہیں۔ پچھلے ہفتہ اسی طرح رات کو سیف احمد کے گھر وہ گھسے تھے اور سب کچھ لوٹ کر لے گئے تھے اور جان سے مار بھی ڈالا تھا'' ـــــ

''لیکن ہم سے کیا دشمنی ہوسکتی ہے اُن کی، وقت بے وقت جب بھی وہ چندہ مانگنے آتے ہیں، اناج مانگتے ہیں دے ہی دیتا ہوں'' ـــــ

''پھر بھی ان لوگوں کا کوئی بھروسا نہیں، آپ دروازہ مت کھولئے۔ پہلے چھت سے دیکھ لیجئے'' ـــــ آمنہ رندھے ہوئے گلے سے بولی۔

مولوی لیاقت علی کو یہ بات پسند آئی وہ ٹارچ لے کر چھت پر چڑھ گئے۔ جب ٹارچ کی روشنی میں انہوں نے اپنے گھر کے اردگرد دیکھا

تو دنگ رہ گئے۔ چاروں طرف نکسلائٹوں نے ان کے گھر کو گھیر رکھا تھا۔ وہ جلدی سے منڈیر سے ہٹے اور نیچے کی طرف بھاگے۔ اب گولیاں چلنی شروع ہوگئی تھیں اور ''نکسل واد زندہ باد'' کا نعرہ بھی بلند ہو رہا تھا۔ گھر کے سارے افراد جاگ چکے تھے لیکن گاؤں پر جیسے مردنی چھائی ہوئی تھی، سبھی گھر کے کواڑ اس طرح بند تھے جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔

اور پھر دروازہ توڑ دیا گیا' ایک......... دو......... دس......... سو......... دوسو......... چار سو......... بندوق......... نیزہ......... تلوار......... بلّم......... بھالا......... کٹار.........!

مولوی لیاقت علی بہت کچھ کہنا چاہتے تھے مگر الفاظ ان کی گرفت سے پھسل پھسل جاتے ہیں۔ اندھیری رات میں ڈوبتا ابھرتا خوف کا سایہ لہراتا ہے۔ آمنہ کا سارا جسم پسینے سے شرابور ہو جاتا ہے۔ سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگتی ہے۔ علی عباس' صبوحی' نشاط' افروز اور امجد اپنے اپنے کمرے کے دروازے پر منجمد کھڑے ہیں۔ سامنے دور دور تک صرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ ساحل سے موجیں اپنا سر ٹکراتی ہیں اور اسی کے ساتھ لیاقت علی کا سر نامعلوم وقت کے حصار میں گر کر اپنا وجود کھو دیتا ہے۔ آمنہ بے ہوش ہو چکی ہے۔ اس کا وجود بے جان لاش کی طرح زمین پر پڑا ہے۔

صحن میں رکھی لالٹین بھی کب کی بجھ چکی ہے۔ امجد اور افروز کا احتجاج' صبوحی اور نشاط کو بچانے کی کوشش نے سب کچھ ختم کر کے رکھ دیا لیکن علی عبّاس اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر پچھلے دروازے سے نکل گیا تھا ـــــــ

آگ کی لپٹوں میں جھلسی ہوئی پاگل ہوائیں مولوی لیاقت علی اور ان کے افراد کی کہانی دور دور تک پہنچا رہی تھیں۔

گہرے منجمد اندھیرے کو چیرتا ہوا علی عباس جنگل جنگل بھاگ رہا تھا۔ اس کا سارا جسم خوف سے لرز رہا تھا۔ وہ رات بھر دانت پر دانت چڑھائے گہری چیخ کو ضبط کئے تڑپتا رہا' سسکتا رہا' روتا رہا ـــــــ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھک لیتا ہے' یا خدا تیرا انصاف کہاں ہے؟ ـــــــ اگلے مہینے ہی صبوحی کی شادی ہونے والی تھی۔ نشاط بھابھی کی تو ابھی گود بھی ہری نہیں ہوئی تھی اور امجد بھیا تو زندگی کا ابھی لطف بھی نہیں اٹھا پائے تھے۔ بیچارہ افروز' کل ہی اس کا دسویں کا امتحان شروع ہونے والا تھا ـــــــ'

گہرے اندھیرے میں اس کی بیتاب آنکھیں سب کی متلاشی تھیں لیکن دور دور تک ان کی صرف چیخیں ہی سنائی دے رہی تھیں۔ ایک ایک چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آتا اور روپوش ہو جاتا ـــــــ'

وہ افسردہ نگاہیں گرد و نواح میں دوڑاتا ہے۔

اندھیرا ـــــــ اور صرف اندھیرا ـــــــ'

سوچ کی روشنی بلند ہوتی ہے اور دور دور تک ایک لمبی لکیر بناتی ہوئی گزر جاتی ہے۔

بدلہ ـــــــ انتقام!

اس کے جسم کی حرارت بڑھنے لگتی ہے' آنکھیں سرخ ہونے لگتی ہیں اور مٹھیاں بھنچ جاتی ہیں۔ وہ ایک جھٹکے سے کھڑا ہو جاتا ہے۔

خون کا بدلہ خون؟

وہ اندھیرے میں چند قدم ہی بڑھتا ہے کہ کسی پتھر سے ٹھوکر کھا کر لڑکھڑا جاتا ہے۔

ٹھہرو؟ـــــ اس کے اندر کوئی کلبلاتا ہے۔

تم کہاں جا رہے ہو؟

تم کیا کرنے جا رہے ہو؟

وہی جوان لوگوں نے کیا ہے؟ تم بھی درندہ بننا چاہتے ہو' تو پھر تم میں اور ان میں کیا فرق رہ جائے گا۔ کل تم بھی ان ہی لوگوں کی طرح جنگلوں اور پہاڑوں میں چھپتے پھروگے اور پولس تمہیں تلاش کرتی پھرے گی' تم بھی کسی مجبور' بے بس' بے کس اور بے گناہ کا خون کروگےـــــ تم جس راستے پر جا رہے ہو' وہاں تمہیں بدنامی اور موت کے علاوہ کچھ نہیں ملے گاـــــ!

عباس ٹھہر جاتا ہے۔ وہ زمین پر اُکڑو بیٹھ جاتا ہےـــــ'

کہیں دور سے آہ و بکا کی آوازیں آ رہی ہیں۔

شاید گاؤں والے اس کے گھر کے گرد جمع ہو گئے ہیں۔

خوف اور اندیشوں کے گھنے جنگل میں اس کا وجود بھٹک رہا ہے۔ کوئی منزل' کوئی نشان منزل تک نہیںـــــ روشنی نہیں' روشنی کا سائبان تک نہیں۔ پیاس کی شدت اس کے ہونٹ اور زبان میں سوئیاں چبھونے لگتی ہے۔ اس کا جسم درد سے بے حال ہے اور تلوے لہو لہان' کتنے کانٹے چبھے تھے اس کے پیروں میں!ـــــ دردـــــ ساری دنیا درد کی گٹھری بن گئی تھی۔

اگر اسے پانی نہیں ملا توـــــ؟

کہاں ہے پانی؟

وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہے۔

کانٹے چبھ رہے ہیں۔

ہونٹ خشک ہوتے چلے جاتے ہیںـــــ'

پیاس کی شدت میں مبتلا پانی کی تلاش میں وہ لڑکھڑاتا ہوا آبادی میں آ جاتا ہے' ایک دوسرا گاؤںـــــ!

یکا یک وہ ٹھٹھک جاتا ہے۔ پتہ نہیں یہاں بھی وہ لوگ؟ـــــ تشویش' خوفـــــ دہشت مگر پیاس کی شدت!ـــــ وہ آگے بڑھتا چلا جاتا ہےـــــ'

دستک!

''پانی چاہئے!''

ایک عورت اسے پانی پلاتی ہے۔ اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ کھلتی جاتی ہیں' بے جان جسم میں تھوڑی سی قوت آتی ہے۔ وہ عورت جب بہ غور اسے دیکھتی ہے تو پہچان لیتی ہے'

''یہ تولیاقت علی کا بیٹا ہے!''

بے پناہ جنگل سے نکل کر اب وہ کسی کی پناہ میں آگیا مگر یہ پناہ کب تک؟

وہ پولس کو اس کی اطلاع دیتا ہے' پھر ——— '

ایف' آئی' آر ——— !

پوچھ گچھ ———!!

چھان پھٹک ———!!!

——— اور گواہوں کی تلاش۔

——— جو طاقتور ہوتا ہے گواہ اس کی طرف جھکتے ہیں۔ پولس کی طرف گواہ نہیں جھکتے ——— '

علی عبّاس کی درخواست پر کسی منتری اور کسی پردھان منتری کا دورہ بھی نہیں ہوتا ——— '

——— علی عباس پھوس کے گھر میں پناہ گزیں ہے۔

اس کا اپنا پختہ گھر خشک پتہ کی طرح اڑ گیا تو' یہ کچی دیواریں؟!

وہ اضطراب میں ٹہل رہا ہے' کسی فیصلہ تک پہنچنا چاہ رہا ہے ——— '

''قانون'' کے وعدوں پر بوڑھا ہو جائے۔

یا ——————— '

خود کوئی قانون بنائے ———؟

●●

"تم جھوٹ بولتے ہو۔"

"جی؟"

"تم بھنگی ہو— جیسے میں بھنگی ہوں۔"

"آھستہ بولو جمعدار۔" کالی چرن ھاتھ جوڑ کر بولا۔ "کوئی سن لے گا۔"

"شرم کی بات ھے۔ نوے روپئے کی خاطر تم نے اتنا بڑا جھوٹ بولا۔ اپنی برادری کو ٹھکرا دیا۔"

"کیا کروں جمعدار۔ بیٹے کو پڑھا رھا ھوں۔ چالس روپئے مھینے میں اس کا خرچہ کھاں سے دوں۔ تمھاری کرپا رھی تو وہ کالج تک پڑھ جائے گا۔"

"اچھا۔" جمعدار کچھ سوچ کر بولا دھیرے سے۔ "مگر ایک شرط ھے۔"

"جو تم کھو جمعدار۔ تم مالك ھو۔"

"آئندہ پھر کبھی ایسی پھرتی اور صفائی سے کام نہ کرنا نھیں تو پکڑے جاؤگے؟" اور پھر وہ چلا کر بولا۔ "کالی چرن تم بابو ھوگے تو اپنے گھر کے ھوگے۔ بھنگی کا کام کرنے آئے ھو۔ بھنگی کی طرح کرنا پڑے گا۔ نوّے روپئے اسپیشل الاؤنس لیتے ھو۔"

(افسانہ "تین بھنگی"، خواجہ احمد عباس)

سفر ابھی ختم نہیں ہوا

شالیمار ویڈیو کوچ پر بیٹھتے وقت بھی میرا ذہن وہیں تھا۔ پل بھر میں کیا سے کیا ہو جاتا ہے اور میں ....لیکن میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ نہیں ....میں ایسا کچھ نہیں کر سکتا جس سے ....۔

''صاحب! کہاں جایئے گا؟ ـــــ کنڈکٹر سامنے کھڑا تھا۔

''ٹاٹا!'' ـــــ اس نے ٹکٹ بنا کر مجھے دے دیا۔ ٹکٹ کو میں نے بیک پاکٹ میں ڈال لیا ـــــ ''پتا نہیں سفر کیسا ہو گا؟''

''بھائی صاحب ماچس ہو گی؟'' ـــــ میرے پیچھے بیٹھے ایک مسافر نے میرے بغل والے مسافر سے دریافت کیا۔ اس نے ماچس اس کی طرف بڑھا دی۔ اب اس نے بھی ایک سگریٹ نکال لیا تھا۔ جب پیچھے والے مسافر نے ماچس واپس لوٹائی تو اس نے بھی ایک سگریٹ سلگا لیا۔

''آپ سگریٹ لیں گے؟'' ـــــ وہ مجھ سے مخاطب تھا۔

''نو، تھینکس!''

اس نے سگریٹ کا دھواں دوسری جانب چھوڑ دیا۔ دوسری طرف ایک بوڑھی عورت اور اس کے بغل میں نوجوان لڑکی بیٹھی تھی۔ لڑکی اس عورت کی بیٹی لگتی تھی۔ اس پر نیند کا غلبہ تھا اس لئے کھڑکی سے لگ کر شاید سو رہی تھی۔ جب سگریٹ کا دھواں اس کی ناک میں گھسا تو اس کے آرام میں خلل پیدا ہو گیا۔

''اوہ! بس میں بھی لوگ سگریٹ پینے سے پرہیز نہیں کرتے'' ـــــ ناگواری اس کے چہرے سے نمایاں تھی۔

اور پھر ڈرائیور نے بس اسٹارٹ کر دی۔ ابھی بس کچھ ہی دور گئی ہو گی کہ خلاصی نے ویڈیو اسٹارٹ کر دیا' جو لوگ کافی تھکے ہوئے تھے اور انہیں اس فلم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی' وہ اونگھ رہے تھے' کچھ بے دلی سے دیکھ رہے تھے اور کچھ دلچسپی کے ساتھ لیکن میں ان سب سے دور بہت دور دیکھ رہا تھا ـــــ

نگواں گاؤں!

جہاں میرے ماتا پتا تھے' چاچا' چاچی اور سبھی تو اپنے تھے' کیا بگاڑا تھا کسی کا ان لوگوں نے لیکن ـــــ '

''بھائی صاحب دیکھیے کتنا دل کش منظر ہے''—— میرے بغل والے مسافر نے مجھے مخاطب کیا'

میرے اندر کا منظر کتنا بھیانک ہے۔ میں نے سوچا—— میرے بغل والا مسافر فلم دیکھنے میں کھو گیا تھا—— اب میرے پاس کیا بچا ہے' سب کچھ تو لُٹ گیا۔ اُف! کتنا بھیانک منظر ہوگا' کیسی قیامت کی گھڑی ہوگی.........

''آپ کس دنیا میں ہیں' یہاں دیکھئے کتنی اچھی فلم چل رہی ہے''—— وہ ایک بار پھر مجھے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے۔

میرے اندر جو فلم چل رہی ہے میں اسے کیسے دکھاؤں؟—— میں کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ بھرا پُرا پریوار اُف!—— آخر مارنے والے بھی تو آدمی ہی تھے۔ مارتے وقت ان کے ہاتھ نہیں تھرتھرائے؟—— پتا جی کتنی شان سے کہا کرتے تھے۔

''مراری ہم اپن دینس کے بی۔اے۔ پڑھائیل بھئی اور بھگوان کے کرپا سے ٹاٹا فیکٹری میں اکرا کے نوکری بھی مل گئیل' ہمار سپنا تو پورا بھئیل مراری' بٹی روپا کے ویہوا کرکے اُکرا اپن گھر بھیج دیلی۔ اب رہ گئیل ہم بوڑھا بوڑھیا' تو دنیس پتر میں لکھل بھئیل کی اوکرا کوارٹر مل گئیلی ہے اور وہ ہمنی کے لیے کھاتر آ رہیل ہے۔''

''کچھو کہو بپت بھائی تو ہرا کے کسمت بڑا اچھا بھئیل۔ بٹی کے تھوڑا بہت پڑھا کے اچھا گھر میں ویہوا کر دیلی اور بیٹا کے بھی لایک بنا دیلی۔''

''ہمرا کہے کے بنی نا مراری جب سرکار ہمرا کے چھوٹ دیلی ہے تو اوکر فائدہ کا ہے نہ اٹھاول جائی۔ ہم نے پھٹ سے سرکار سے ایک گمٹی لے کے بازار میں جوتا چپل کی دکان کھول دیلی اور بیٹا بٹی کے پڑھا کے اپن فرج تو پورا کر دیلی' اب ہم بہت کھوس بنی''——

اب میرے بغل والے مسافر کو نیند آنے لگی ہے کیوں کہ اس کے لڑھکنے سے ہی میرے خواب کے باریک دھاگے ٹوٹے تھے۔ شاید فلم کلائمکس پر پہنچ گئی تھی اور رات اپنے اختتام پر!——

میں اپنے ماتا پتا کو اپنے نئے کوارٹر میں نہ لے جا سکا' ان کو کوئی بھی سکھ نہ دے سکا۔ انہوں نے تو اپنا فرض ادا کر دیا لیکن میں اس فرض کا ایک حصہ بھی نہیں چکا پایا۔ دو دن بعد انہیں لانے کے لئے جانے ہی والا تھا کہ ٹیلی گرام نے بتایا کہ انہیں قتل کر دیا گیا۔ صرف انہیں ہی نہیں بلکہ ان جیسے اور کئی لوگوں کو بھی۔

فلم ختم ہوگئی اور گاڑی بھی ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ ڈرائیور گاڑی سے اتر گیا۔ ایک دو مسافر بھی اترنے لگے۔ میں بھی اتر گیا۔ باہر صبح کی سپیدی پھیل چکی ہے۔ اکّا دکّا لوگ کھیتوں میں لوٹا لے کر آتے جاتے نظر آنے لگے ہیں۔ ڈرائیور اور خلاصی بھی ٹین کا ایک ایک ڈبّہ لے کر کھیت کی طرف چل دیئے۔ سڑک کی دوسری طرف ایک ڈھابہ ہے۔ جہاں گرم گرم کچوریاں اور جلیبیاں تلی جا رہی ہیں۔ بس رکنے کے ساتھ ہی حلوائی کے ہاتھ میں تیزی آ گئی ہے۔ وہ جانتا تھا تقریباً سارے مسافر ناشتہ یہیں کریں گے—— میں واپس سیٹ تک آیا۔ بیگ سے تولیہ اور برش نکالا اور ہوٹل کی طرف چل دیا۔

''آیئے صاحب آیئے' منہ دھونا ہے۔ وہ رہا چاپا کل' ارے موہنا ذرا چاپا کل چلا دے۔ صاحب منہ ہاتھ دھوئیں گے''—— ڈھابے کا مالک مجھے دور ہی سے دیکھ کر چلایا۔

میں ہینڈ پمپ تک پہنچ گیا اور موہنا بھی۔ منہ ہاتھ دھو کر جب فارغ ہوا تو ڈھابے کے باہر ہی بچھی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''صاحب کیا لائیں!''——— ایک نوکر میرے سامنے کھڑا ہے۔

''ابھی ٹھہرو۔''

اب کئی مسافر ڈھابے میں آ گئے ہیں۔ ڈرائیور اور خلاصی بھی کھیت سے واپس آ گئے ہیں اور ہینڈ پمپ کے پاس بیٹھ کر داتون کرنے لگے ہیں۔ ڈرائیور منہ دھو کر پیجامہ کھول کر کچھا پہنے ہینڈ پمپ کے نیچے بیٹھ گیا۔ موہنا مسلسل ہینڈ پمپ چلا رہا ہے۔ بدن پر پانی ڈالنے کے بعد دونوں ڈھابے کے قریب بچھی دوسری چارپائی پر آ گئے۔

''ساب آپ نے ناستہ کر لیا؟''——— ڈرائیور مجھ سے مخاطب تھا۔

''مجھے ناشتہ نہیں کرنا ہے۔''

''سرفو جرا جا کر بس میں کہہ دے کہ جس کو ناستہ کرنا ہے کر لے' بس اب ٹاٹا ہی میں رکے گی۔''

سرفو بس تک چلا گیا۔

قریب آدھے گھنٹے کے بعد پھر سفر شروع ہوا۔ اب سڑکوں پر دیگر بسوں اور ٹرکوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی تھی۔

انسان حیوان کیسے بن جاتا ہے۔ میں نے پھر سوچنا شروع کر دیا۔ میری خوشی کا کنول کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گیا۔ اب کامنی سے شادی کرنے میں کسی کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ میرے پاس اچھی نوکری ہے' کوارٹر بھی مل گیا ہے۔ کامنی جو میرے کالج کی دوست ہے' مجھے کتنا چاہتی ہے——— پہلے تو اس کے پتا شادی کرنے کے حق میں قطعی نہیں تھے لیکن اب وہ تیار ہو گئے ہیں۔ پچھلی بار جب کامنی کے گھر گیا تھا تو کتنی عزت سے بٹھایا تھا۔ گاؤں کی خیریت پوچھی تھی۔ ماتا پتا کے بارے میں باتیں کی تھیں اور کامنی کی ماں بھی کس قدر خوش دکھائی دے رہی تھی اور کامنی کا تو کہنا ہی کیا تھا۔ کامنی کے پتا جی نے کہا تھا:

''بیٹے دنیش میں چاہتا ہوں کامنی کی شادی جلد ہو جائے تاکہ میں اس پنیہ کام سے نجات ہی حاصل کر لوں۔ اس بار گھر جانا تو اپنے ماتا پتا کو ضرور لے کر آنا۔ وہ لوگ بھی کامنی کو دیکھ لیں گے اور شادی کا مہورت بھی نکال لیں گے۔''

بس ایک جھٹکے کے ساتھ رکی۔ ڈرائیور نے کھڑکی سے منہ نکال کر ایک بھدی سی گالی دی——— ''حرام جادے!———' میری گاڑی ہی کے نیچے مرنا ہے۔''

وہ مزدور آدمی سڑک کے کنارے ہو گیا۔ بس کی رفتار بہت کم ہو گئی ہے کیونکہ بازار میں بھیڑ بہت ہے۔

''ارے سالے.....رکسا چلاتا ہے یا ہوائی جہاج!''——— خلاصی ایک رکشے والے کو گالی دے رہا ہے اور سیٹی بجا بجا کر بس کو آگے بڑھوا رہا ہے۔

''آ ئیل طوفان میل گڑیا ہو ساڑھے تین بجے ریتا.....'' ڈرائیور نے ایک لڑکی کو دیکھ کر ٹیپ آن کر دیا۔

دھیرے دھیرے بس بھیڑ سے نکلتی گئی اور اب سامنے لمبی سڑک تھی———

اب میری زندگی بھی اس ویران سڑک کی مانند ہے جہاں میرا کوئی سرپرست نہیں، کوئی مشیر کار نہیں۔ اب اکیلے ہی سب کچھ کرنا ہے۔

''پنجاب میں دس لوگوں کا بہیمانہ قتل!——— میرے بغل والے مسافر نے یہ خبر زور سے پڑھی۔ اس نے بازار سے گزرتے ہوئے اخبار خرید لیا تھا!

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس دیس کا کیا ہوگا؟''——— میرے آگے والے مسافر نے اپنا منہ اخبار کی طرف کر لیا اور پیچھے کی خبر پڑھنے لگا۔

''سری نگر میں دس اُگروادی مارے گئے''——— میرے آگے والے مسافر نے بھی اس خبر کو زور سے پڑھا۔ اس خبر پر میرے سامنے والی لڑکی چونکی۔

''یہ پنجاب کا مسئلہ کب حل ہوگا؟''——— میرے پیچھے والے مسافر نے سر اونچا کر کے میرے آگے والے مسافر سے پوچھا۔

''مجھے تو کوئی آثار نظر نہیں آتے۔''

''نہیں بھائی ہو جائے گا سری لنکا میں دیکھئے کس طرح شانتی سینا نے آہستہ آہستہ آتنک وادیوں پر قابو پایا۔''

''وہاں کی بات اور ہے۔ یہاں تو آتنک وادی گھروں اور مندروں سے فائرنگ کرتے ہیں۔''

''لیکن یہ سب صرف پنجاب یا کشمیر میں ہی نہیں ہندوستان کے کئی گوشوں میں ہو رہا ہے۔ یہاں بہار میں کیا ہو رہا ہے؟''——— میرے بغل والے مسافر نے ایک اور سوال اچھال دیا۔

''کچھ بھی کہو بھائی سرکار نے ہریجنوں کو بڑی چھوٹ دے رکھی ہے۔ اسکول میں، کالج میں، نوکری میں سیٹ ریزرو، انٹرویو میں شامل ہونے کے لئے کرایہ دیتی ہے اور اونچی ذات والوں کو ہر جگہ اپنے خرچ سے آنا جانا پڑتا ہے۔ کیا ان کے گھر میں روپے کا درخت ہوتا ہے۔ اب تو زمینداری بھی نہیں رہی——— ہم نے مانا کہ ہریجن پچھڑے ہوئے ہیں اور انہیں بڑھاوا دینا بھی چاہئے لیکن ایک حد تک!——— ایک طبقے کا استحصال کر کے اگر دوسرے کو اتنی چھوٹ دی جائے گی تو یہی ہوگا!''——— میرے پیچھے والے مسافر نے ایک لمبی تقریر جھاڑ دی۔

''بیک ورڈ فارورڈ تک ہی سارا معاملہ کہاں ختم ہوتا ہے۔ پھر مسئلہ اقلیت کے استحصال کا بھی تو ہے؟''——— ایک مولوی صاحب جو کافی دیر سے سب کی باتیں سن رہے تھے بول پڑے۔

''وہ تو ہے لیکن ....'' ایک مسافر بول ہی رہا تھا کہ ڈرائیور نے ٹیپ کا ساؤنڈ اتنا بڑھا دیا کہ ساری آوازیں پس منظر میں چلی گئیں———

●●
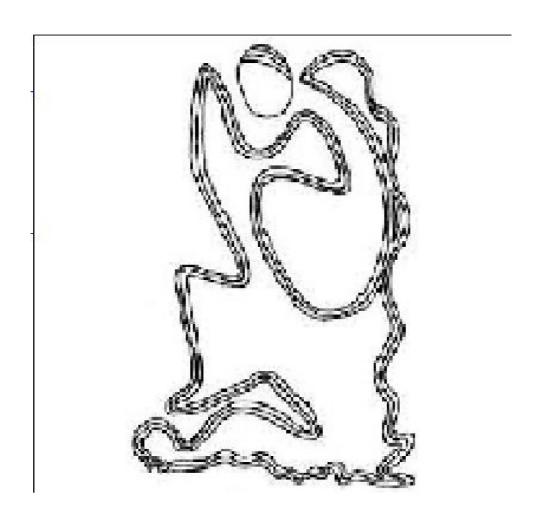
نادر بولا۔ "اگر اس جوتے کے دام مل جاتے تو میں جلدی جلدی سے اپنے جوتے کا کوئی انتظام—"

"دام؟" راجہ شیر خاں کی آواز گونجنے لگی۔ یعنی نقد دام مانگتا ہے؟ آج تک راجہ شیر خاں سے کسی نے نقد دام مانگے ہیں جو تو مانگنے چلا ہے۔ غضب خدا کا دو پیسے کا جوتا گانٹھنے والا اور ساٹھ روپئے کا جوتا پھنے۔ جوتاپھنے بغیر ناک کٹی جا رہی ہے۔ چل دفعہ ہو یہاں سے۔ منشی جی لکھ لو اگلی فصل پر اس موچی کو پندرہ بیس روپئے کی گندم تلوا دینا۔

(افسانہ "موچی"، احمد ندیم قاسمی)

آگ ابھی باقی ہے

کنتی نہ جانے کتنی سیاہ دہ بدصورت رات کو اپنے اندر سرایت کر چکی تھی۔ رات رات بھر نینداور بے خوابی کے عالم میں کمرہ میں ٹہلتی رہتی تھی۔ کبھی آدھی رات کے گہرے سناٹے میں کنتی کے تاریک کمرہ سے سسکیوں کی آوازیں سنائی دیتیں۔ کبھی کراہیں، کبھی آہیں جیسے کوئی بھاری پتھر اس کے سینے پر رکھ دیا گیا ہو جس کے نیچے بے تاب کراہیں دم توڑ رہی ہوں۔ اکثر جب وہ گہری نیند میں ہوتی تو مسز شرما کی تیز نوکیلی آواز اس کے ذہن پر اس طرح وار کرتی کہ بوکھلا کر نیند سے بیدار ہو جاتی اور اٹھ کر بیٹھ جاتی اس وقت اس کا پورا بدن پسینے سے شرابور ہو جاتا اور پھر اسے تمام رات نیند نہیں آتی۔ وہ اپنے بدن کو ٹٹول کر دیکھتی کہ کہیں چابک کے نشان اس کے بدن پر تو نہیں ابھر آئے ہیں۔ کبھی وہ محسوس کرتی کہ اس کے سینے پر اپنے چر چراتے ہوئے بھاری جوتوں سے چلتا ہوا ڈاکٹر شرما گزر گیا ہے۔ رات گزرتی رہتی۔ ایک ایک کر کے آسمان کے تارے افسردہ سے افسردہ تر ہوتے جاتے۔ وہ کھڑکی سے جھانک کر دیکھتی جنوبی سمت کی طرف اونچی اونچی عمارتوں کی رنگین جاگتی سوتی بتیاں جلتی بجھتی رہتیں، رات گزرتی ہی چلی جاتی اور وہ گھونٹ گھونٹ ساری سیاہ رات کو پیتی چلی جاتی۔

''زندگی کسی کو کہاں جینے دیتی ہے۔'' —— کنتی اکثر سوچتی — ہر پل یہ زندگی بے نیازانہ دکھتی ہے جیسے پوچھ رہی ہو کہ تم کون ہو؟ —— تمہارا وجود کیا ہے؟ —— کیوں ہے؟ —— اور کس کے لیے ہے؟ —— اس کا جواب کنتی کے پاس نہ تھا۔

دن کا اُجالا پھیلتے ہی وہ گھر کے کام میں اس قدر مصروف ہو جاتی کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ انسان بھی ہے۔ مشین کی طرح رات کے بارہ بجے تک گھر کے سارے کام نپٹا کر جب وہ اپنے چھوٹے سے تاریک کمرہ میں آ کر بستر پر اپنے تھکے جسم کو پھیلا دیتی تو کچھ پل کے لیے اس کو سکون کا احساس ہوتا لیکن درد سے اس کا پور پور ٹوٹتا ہوا محسوس ہوتا —— کاش اس کے تھکن سے چور بدن کو کوئی زور زور سے دباتا تا کہ اس کی تھکن دور ہو جاتی مگر وہاں نہ کوئی اس کے درد کو سمجھنے والا تھا اور نہ اس کی تھکن کا کسی کو احساس تھا۔ مسز شرما اسے دن بھر کولہو کے بیل کی طرح پیرتی رہتی۔ بات بات پر نہ صرف جھڑکتی بلکہ مار بھی بیٹھتی شاید ہی کوئی دن ایسا ہوتا کہ کنتی مسز شرما سے نہ پٹتی ہو۔ ایک ایک کام کے لیے کنتی کو ہی آواز دیتے، دیر ہونے پر کھا جانے والی نظروں سے گھورتے، کبھی کبھی غصے میں آ کر جوتے سے مار بھی بیٹھتے۔ کنتی کئی بار زخمی ہو چکی تھی لیکن اس کے زخم کو دیکھنے والا وہاں کون تھا۔ ڈاکٹر شرما نے دس ہزار دے کر گویا اسے زر خرید غلام بنا لیا تھا۔

کنتی تیرہ چودہ سال کی ہوگی۔ رنگ سانولا لیکن روپ متاثر کن اور جسم گداز تھا۔ ڈاکٹر پردیپ شرما جب اس بار بہار اپنے گاؤں فتح پور

گئے تھے تو کنتی کو ساتھ لے کر آ گئے تھے۔ کنتی ڈاکٹر شرما کے گاؤں میں مسہر محلے میں رہتی تھی۔ اس کا باپ کھیت میں مزدوری کرتا تھا اور ماں ڈاکٹر شرما کے گھر جھاڑو پوچھا کا کام کرتی تھی۔ کنتی کی ایک بڑی بہن پارو تھی جو بانس کی لکڑیاں بنتی، اور بازار میں جا کر فروخت کرتی تھی۔ کنتی سے چھوٹے کئی بھائی بہن تھے جو دن بھر آپس میں لڑائی جھگڑے کرتے رہتے تھے۔ کنتی کی ماں نے کسی طرح پارو کا بیاہ مسہر پریوار میں ایک لڑکے سے طے کر دی تھی لیکن بیاہ کے لیے اس کے پاس پیسے نہ تھے۔ ایک دن موقع دیکھ کر ڈاکٹر شرما سے بولی:

''مالک ہم اپنی بیٹی پارو کے بیاہ طے کر دیے ہیں۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔''

''بابو مگر ایک بات ہے؟''

''ہاں ہاں کہو۔ کیا بات ہے؟''

''مالک آپ جانتے ہیں کہ ہم گریب لوگ ہیں، دو وکت کی روٹی کا انتجام کسی طرح کر لیتے ہیں۔ سادی بیاہ میں تو کچھ نہ کچھ خرچہ تو آئے گا اور ہمرے پاس اتنا پیسہ نہیں کہ بیٹی بیاہ سکیں۔''

''ہم سے کیا چاہتی ہو۔''

''اگر کچھ روپیہ کی مدد کر دیتے تو بڑا احسان ہوتا اور پنیہ بھی۔''

ڈاکٹر شرما کچھ دیر تک سوچتے رہے۔ پھر گویا ہوئے۔

کتنے روپے میں کام چل جائے گا؟''

''ڈاکٹر بابو دس ہزار دے دیتے تو ہمرا سارا کام نپٹ جاتا۔''

''دس ہزار تو زیادہ ہے۔ ہم ایک دو ہزار کی مدد کر سکتے ہیں۔''

''بابو اتنے میں کا ہوگا۔ دس ہجار دیجیے گا تو کسی اور کے آگے ہاتھ پھیلاوے کے جرورت نہ پڑی۔''

ڈاکٹر شرما دیر تک سوچنے کے بعد ایک فیصلہ کرتے ہیں۔

''بگنی تیری ایک بیٹی کنتی بھی تو ہے۔ کتنے سال کی ہے؟''

''بابو بارہ تیرہ سال کی ہوگی۔''

''ایسا کرو اسے میرے ساتھ دلّی بھیج دو۔ وہاں ہمارے ساتھ رہے گی۔ گھر میں جھاڑو پوچھا کر دیا کرے گی۔ میری پتنی اکیلی رہتی ہے۔ اس کا بھی دل لگے گا۔ گھر میں جو پکے گا وہ بھی کھائے گی۔ کپڑے وغیرہ دے دیا کروں گا اور پانچ سو روپیہ بھی تمہیں ہر مہینے بھیج دیا کروں گا۔ اگر تمہیں منظور ہے تو بولو میں دس ہزار روپیہ دے کر تمہاری مدد کروں گا۔ اور اسے واپس بھی نہیں مانگوں گا۔

''ڈاکٹر بابو وہ تو ٹھیک ہے لیکن پہلے اپنے پتی اور کنتی سے پوچھ کر دیکھتے ہیں اگر وہ دونوں تیار ہو گئے تو مجھے کوئی اتراج نہیں ہے۔''

''پوچھ لو اتنا اچھا موقع تمہیں نہیں ملے گا۔ دلّی میں تو نوکر بہت مل جائیں گے لیکن ہمیں جان پہچان کا کوئی آدمی چاہیے جو چوبیس گھنٹے

ساتھ رہے۔''

''ٹھیک ہے بابو بات کر کے آپ کو بتا دیں گے۔''

''ہاں ایک اور بات بتا دوں کی کنتی پانچ سال تک واپس نہیں آئے گی البتہ جب جب گرمی کی چھٹی گزارنے گاؤں ہم لوگ آئیں گے کنتی کو بھی ساتھ لے کر آئیں گے اور ساتھ ہی لے کر جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے مالک ہم اس بارے میں کل بتا دیں گے۔''

کنتی دلّی آنے کے بعد خود کو بالکل تنہا محسوس کرتی ہے ——— بالکل اکیلی ——— بن بادل اور پیاس سے بھری پانی تلاشتی بہت دور نکل آئی تھی۔ جیسے کسی گھنگور صحرا میں آ گئی ہو۔ وہ نہ جانے کب سے یوں ہی کھڑی ہے۔ خاموش ——— اور اس کے پاس سے کئی موسم گزرتے جا رہے ہیں۔ جب بھی رات کا پچھلا پہر بھیگتا کنتی اپنے کمرے میں سسک سسک کر رو پڑتی۔ وہ کھل کر رو بھی نہیں سکتی تھی۔ رونے سے اس گھر کے مکینوں کی نیند میں خلل پڑ سکتا تھا۔ کنتی کا درد ہر لمحہ بڑھتا رہا تھا کہ اب درد اس کے مقدر کی کتاب کے ہر سبق کا عنوان بن گیا تھا۔ محسوس کرتی کہ اس کے آس پاس نہ کوئی پیڑ ہے نہ کوئی سایہ بس صحرا ہی صحرا ہے اس کے ہونٹ پیاس سے سوکھ چکے تھے اور آنکھیں جل رہی تھیں۔ زندگی کنتی کو ہر لمحہ رلا رہی ہے جلا رہی ہے۔ پھر بھی وہ جئے جا رہی ہے۔ غموں کو پئے جا رہی ہے۔ اس کی خوشی کا پرندہ ایک ایسے پنجرے میں پھڑ پھڑا رہا ہے جس کے سبھی دروازے کھلے تو ہیں مگر وہ پھر بھی مقید ہے۔ وہ جانتی ہے اگر یہاں سے بھاگ گئی تو ڈاکٹر شرما اسے کسی بھی کیس میں پھنسا کر جیل بھجوا سکتے ہیں۔ اس کے گھر والوں کو پریشان کر سکتے ہیں۔

کنتی ہر لمحہ اپنا احتساب کرتی۔

اس کا گناہ کیا ہے؟

یہی کہ مسہر گھر میں پیدا ہوئی۔ بچپن سے مفلسی اس کی تقدیر بنی رہی اور اب بے بسی اس کا مقدر ———

''ہے بھگوان یہ تیرا کیسا انصاف ہے کہ کسی کو اتنا امیر بنا دیتا ہے کہ وہ کھاتے کھاتے مر جاتا ہے اور کوئی بھوک سے جان دے دیتا ہے۔ امیر امیر ہی بنتا جا رہا ہے اور غریب غربت ہی میں مر جاتا ہے۔ یہ امیری غریبی کی کھائی کب کم ہوگی۔ کب ہر انسان برابر ہوگا۔ کہیں ایسا تو نہیں میرے حصے کا ہر سکھ امیروں نے اپنی عالی شان عمارتوں میں قید کر رکھا ہے۔''

کنتی آنکھیں بند کیے بہت دیر تک سوچتی رہی۔ ٹوٹتی ہوئی رات اس کے پہلو سے گزرتی گئی اور وہ بے سدھ آنکھیں بند کیے اپنے بوسیدہ کمرہ کے بوسیدہ بستر پر پڑی رہی۔ ایک تل چٹہ اس کے سمیض کے اندر گھس گیا اور سرسرانے لگا۔ یہاں سے وہاں تک۔ اس نے سمیض کے اوپر تل چٹہ کو انگلیوں سے زور سے دبایا۔ تل چٹہ سرسرانا چھوڑ دیا۔ وہ ادھ مرا ہو چکا تھا۔ کنتی نے تل چٹہ کو سمیض سے باہر نکالا اور زمین پر پٹخ کر پیر سے مسل دیا۔ اس کے اندر غصے کا ایک لاوا ابھرا تھا۔ وہ تل چٹہ مرنے کے بعد ختم ہو گیا۔ مسز شرما بھی اسے تل چٹہ کے موافق نظر آئی۔ ہر لمحہ وہ بھی اس کے بدن پر رینگتی رہتی اور نہ جانے کب اس سے نجات ملے۔

کنتی کے غصے میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا لیکن وہ غصے کو دبائے رکھتی کہ اس کی حیثیت ہی کیا تھی۔ وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ وہ اپنا دکھڑا

کسے سناتی۔ سننے والا تھا کون؟ بس اندر ہی اندر کڑھتی رہتی۔ اسے لگتا کوئی آئے گا اور اس نرک سے نکال کر لے جائے گا لیکن دور دور تک اس کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

آج اس کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ مسز شرما رہ رہ کر اس پر ناراض ہو رہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں کڑھ رہی تھی۔ ابھی وہ باتھ روم سے کپڑا صاف کر کے نکلی ہی تھی کہ مسز شرما نے اسے روک لیا۔

''صبح سے برتن کچن میں رکھا ہے۔ صاف کون کرے گا تیرا باپ؟''

''مالکن صبح سے کام ہی تو کر رہی ہوں۔ بخار آ گیا ہے' اس لیے دیر ہو گئی۔''

''نخرے دکھاتی ہے۔ بخار لگنے کا بہانہ کرتی ہے۔ یہ سب یہاں نہیں چلنے والا۔ تیری ماں کو دس ہزار روپیہ دیا ہے اور ہر مہینے پانچ سو روپیہ بھجواتی ہوں' حرام کا پیسہ نہیں آتا ہے۔''

''مالکن کام ہی تو کر رہی ہوں۔''

''منہ لگاتی ہے ایک طمانچہ دوں گی تو سارا بخار اتر جائے گا۔''—— مسز شرما غصے سے کانپ رہی تھی۔

کنتی مڑ کر جیسے ہی کچن میں داخل ہونا چاہ رہی تھی مسز شرما نے زور سے چلایا: ''اے ادھر آ.....''

کنتی پلٹی۔ اس نے مسز شرما کے تیور کو دیکھا۔ وہ غصے سے بری طرح کانپ رہی تھی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ آج پھر اس کی پٹائی ہونے والی ہے۔ وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھی نہ جانے اس کے اندر کہاں سے اتنی جرأت پیدا ہو گئی کہ مسز شرما کے قریب پہنچتے ہی ایک زوردار طمانچہ اس کے گال پر رسید کیا۔ مسز شرما لڑکھڑا کر گر پڑی۔ کیونکہ وہ اس ناگہانی واقعہ کے لیے تیار نہ تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتی کنتی تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

●●
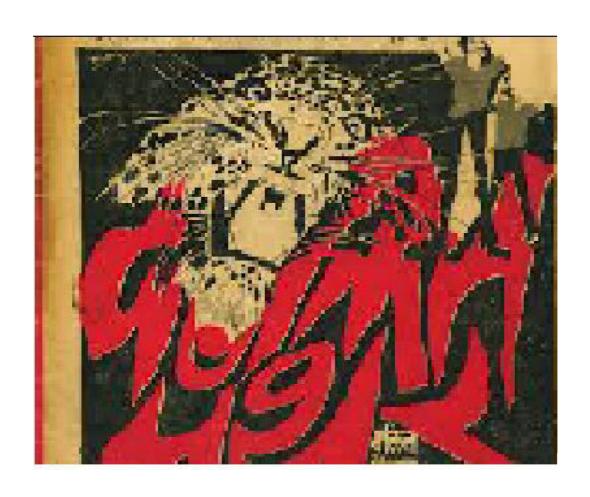
"رنڈی۔" مالکن منه بچکا کر صرف اتنا ھی چپکے سے کهه سکیں۔ لیکن دوسری صبح مالکن نے رات چھٹکی کے کھٹولے سے غائب ھونے پر جو باز پرس کی تو معراجو میاں نے ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کیا که انھوں نے کل چھٹکی سے نکاح کر لیا ھے۔" ایك لمحے کے لئے جیسے سارا گھر حق دق رہ گیا۔ لو بھلا اتنا بھی ندیدہ پن کیا؟ مانا که کنبے کی لڑکی نھیں مل رھی تھی تو اس کا یه مطلب تھوڑے ھی تھا که کمینی کو سر چڑھا لیتے اور پھر اگر ایسی ھی کوئی مجبوری تھی تو یوں ھی کام چلا لیتے' نکاح کی کیا ضرورت تھی؟ اب جو گھر والے بگڑے اور ذرا چھٹکی کے بال پکڑ کر دس پانچ ھاتھ مار دئیے تو معراجو میاں' وھی معراجو میاں جو اپنے باپ کے مرنے کے بعد سے ماموں کی روٹیاں توڑ رھے تھے۔ مقابلے پر آ گئے۔ بوڑھے ماموں کو ان کی لغزشوں کا طعنه دیا اور کنبے بھر کی ڈھکی چھپی کھولنے پر اتر آئے۔ الله کی شان که ایك بھیك منگی کی خاطر ایسا ایسا کھا که کتے کوے بھی گھن کھائیں۔ یوں ناك کٹانے کے بعد چھٹکی کو لے کر اسی گلی کے ایك چھوٹے سے مکان میں بس گئے۔

(افسانه "کمینی" ھاجرہ مسرور)

کاہے کو بیاہی بدیس

زندگی ایک دائرہ ہی تو ہے۔عدم سے عدم تک سفر میں مصروف ہے——'

انسان کسی نہ کسی بہانے سے اس دائرے میں داخل ہو جاتا ہے اور اس دائرے میں اس وقت تک چکر لگا تا رہتا ہے جب تک اس کی زندگی کا سورج غروب نہیں ہو جاتا۔

دائرہ کبھی کاغذ پر بنتا ہے کبھی کاغذ کے باہر۔کاغذ پر بنا دائرہ مٹ سکتا ہے مگر کاغذ کے باہر کا دائرہ توڑنے کے لئے جدو جہد کرنی پڑتی ہے جو توڑنے میں کامیاب ہو جاتا ہے وہ اپنا ایک نیا دائرہ بنالیتا ہے اور جو کامیاب نہیں ہوتا وہ اسی دائرے میں چکر لگا تا رہتا ہے۔

ایک مکان کے وسیع وعریض ڈرائنگ روم میں پانچ بھائی ایک دائرے کی شکل میں بیٹھے ہیں۔ان کی ماں کو دنیا چھوڑے ایک سال کا وقفہ گزر چکا ہے اور باپ تو پانچ سال پہلے ہی سورگ میں پناہ لے لی تھی۔ایک سال تک پانچوں بھائیوں نے گھر گرہستی تو کسی طرح سنبھال لی لیکن اب اس گھر میں ایک عورت کی موجودگی کا احساس شدّت سے سبھی بھائی محسوس کر رہے تھے۔خاموشی کی مدّت جب طویل ہوگئی تو چھوٹے بھائی شیام نے خاموشی کے سمندر میں اپنے الفاظ کا پتھر پھینکا۔

''آپ لوگ اسی طرح خاموش بیٹھے رہیں گے یا کسی نتیجے پر پہنچیں گے بھی۔''

چاروں بھائیوں نے شیام کی طرف دیکھا۔بڑے بھائی وکرم نے کھنکھار کر کہا——

''مسئلہ یہ ہے کہ ہم میں سے شادی کون کرے گا؟''

''آپ گھر میں سب سے بڑے ہیں اس لئے شادی بھی آپ ہی کریں گے''—— منجھلے بھائی موہن نے چھوٹتے ہی کہا۔

''نا بابا نا.........میں شادی بیاہ کے جھمیلے میں نہیں پڑنا چاہتا۔بابا کا چھوڑا ہوا اتنا سارا کھیت ہے' باغ ہے' اسے کون دیکھے گا۔کھیت میں' باغ میں ہر روز کوئی نہ کوئی کام ہوتا ہی ہے۔اس لئے مجھے چھوڑ دو.........''

وکرم اپنا دامن بچا کر اس طرح نکلنا چاہا' جس طرح کبھی کبھی کوئی مچھلی جال توڑ کر نکل جاتی ہے۔

''تو پھر منجھلے بھیا شادی کرلیں''—— تیسرے بھائی سنتوش نے موہن کی طرف دیکھ کر کہا جو بیٹھا کسی کاغذ کو پڑھ رہا تھا۔اپنا نام سن کر اس نے کاغذ سے نظر اٹھا کر سنتوش کی طرف دیکھا۔

’’مجھے کہاں پھنسا رہے ہو سنتوش .... میں تو بابا کی فیکٹری میں اپنا سر کھپا تا رہتا ہوں .... فیکٹری کو ابھی بہت آگے لے جانا ہے۔ بابا کا یہی خواب تھا۔ اس لئے مجھے بخش دو۔‘‘

موہن شادی کے نام پر اس طرح بھاگا جیسے کوئی زہریلا سانپ اس کا پیچھا کر رہا ہو۔

’’تو پھر سنتوش بھیا ہی شادی کریں گے۔ فیصلہ ہو گیا‘‘ ــــــ چوتھا بھائی منوج یہ جملہ بول کر اس طرح کھڑا ہو گیا جیسے فیصلہ ہو گیا ہو۔ اس نے آگے بڑھ کر فریج سے ایک بوتل نکال کر پانی پینے لگا۔

’’تم کون ہوتے ہو فیصلہ کرنے والے۔ میں تم سے بڑا ہوں اور پیشے سے وکیل بھی ہوں۔ میں دن بھر کورٹ میں مغز ماری کرتا رہتا ہوں پھر موکل سے الجھتا رہتا ہوں۔ مجھے فرصت کہاں گرہستی سنبھالنے کی۔ اس لئے شادی تم ہی کرو۔‘‘

سنتوش نے اپنی وکالت کا رعب دکھا کر گیند منوج کے پالے میں پھینک دیا۔

’’نہیں میں نہیں کرنے والا۔ میں فلموں میں اپنا قدم جمانے کے لئے ممبئی آتا جاتا رہتا ہوں۔ میں پہلے اپنا کیریر بناؤں گا پھر شادی کے بارے سوچوں گا اور اگر شادی کی بھی تو کسی ہیروئن سے ہی کروں گا۔‘‘

منوج نے بھی اپنا دامن اس طرح جھاڑ لیا۔ جیسے کوئی اپنے دامن سے گرد جھاڑتا ہے۔

’’تو پھر کون کرے گا شادی؟‘‘ ــــــ سنتوش نے گرج کر کہا۔ جیسے اس کے حق میں فیصلہ ہونے والا ہو۔

’’تم لوگ اس طرح نہ الجھو......... میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ شیام گھر میں سب سے چھوٹا ہے۔ بی۔ اے۔ پاس کر کے نوکری کی تلاش کر رہا ہے۔ میں تو کہتا ہوں اسے نوکری کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ہمارے پاس اتنا سب کچھ ہے وہ ہم پانچ بھائیوں کا ہی تو ہے تو میرا فیصلہ یہ ہے کہ شیام شادی کرے گا اور ہم لوگ بابا کا چھوڑا ہوا سارا کھیت، بزنس سنبھالیں گے۔‘‘ ــــــ وکرم نے فیصلہ سنا دیا۔

’’ہاں یہ ٹھیک رہے گا‘‘ ــــــ تینوں بھائیوں نے ایک ساتھ کہا اور سبھی کے چہرے پر خوشی کی لکیریں ابھر آئیں کہ وہ شادی سے بچ گئے۔

’’شیام تمہیں کچھ کہنا ہے‘‘ ــــــ سنتوش نے کچھ لمحہ رک کر پوچھا۔

’’شیام کافی دیر خاموش رہا پھر گویا ہوا ــــــ

’’جب آپ لوگوں نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو مجھے اعتراض کیا ہو سکتا ہے۔ آپ سب لوگ گھر میں بڑے ہیں۔ آپ کے فیصلے کا احترام کرنا میرا فرض ہے۔ مجھے کچھ نہیں کہنا ہے‘‘ ــــــ شیام اتنی جلدی مان جائے گا کسی کو یقین نہیں تھا۔ ذرا بھی چوں چرا نہیں کیا۔

’’تو ٹھیک ہے جلد ہی لڑکی تلاش کی جائے اور اس گھر میں شہنائی بجوائی جائے‘‘ ــــــ منوج نے کھڑے ہو کر کہا۔

سبھی بھائی اٹھ کر اپنے اپنے کام میں مشغول ہو گئے اور شیام اپنے کمرہ میں لوٹ آیا۔ وہ شادی کے تصور میں کھو گیا۔ وہ عمر میں سب بھائیوں سے چھوٹا تھا اور دنیا داری کا تجربہ بھی نہیں تھا۔ چاروں بھائی اس سے بے حد پیار کرتے تھے کسی بھی چیز کی کمی نہیں ہونے دیتے جو چاہتا مانگ لیتا اور سبھی بھائی اس کی ہر خواہش پوری کرتے رہتے۔

چند مہینوں کی کوشش کے بعد چاروں بھائیوں نے چنچلا کا انتخاب کیا۔شادی کی تاریخ طے ہوگئی۔سبھی بھائی مل کر شادی کی تیاری میں مشغول ہوگئے۔زمانے کے بعد اس گھر میں خوشی نے دستک دی تھی اور اس خوشی کو گھر کا ہر فرد انجوائے کرر ہا تھا۔آج شیام کا گھر برقی قمقموں سے سجا تھا۔شہنائی بج رہی تھی۔گھر میں روشنی کی برسات ہو رہی تھی اور شیام کے دل میں بھی چنچلا کو پانے کی خواہش کا چراغ جل بجھ رہا تھا۔ شادی بحسن وخوبی انجام پا گئی۔

شیام جب چنچلا کے کمرہ میں پہنچا۔اس کا دل دھک دھک کرر ہا تھا۔کس طرح چنچلا کا سامنا کرے گا۔کیا کہے گا اس سے۔وہ مجھ سے کیا بات کرے گی۔گھر میں کوئی بھابھی نہیں تھی جو اسے دلہن کے ملن کے بارے میں کچھ بتاتی۔شیام ڈرتے ڈرتے کمرہ میں گیا اور پلنگ پر بیٹھ گیا۔چنچلا گھونگھٹ میں تھی۔جب کافی دیر تک شیام کچھ نہ بولا تو چنچلا نے گھونگھٹ اُلٹ دیا۔اس نے شیام کو دیکھا۔

''آپ اتنی دور کیوں بیٹھے ہیں۔پاس آیئے نا.........''

شیام ڈرتے ڈرتے اس کے پاس گیا۔اس نے اس کے معصوم چہرے کو دیکھا۔چہرہ کندن کی طرح چمک رہا تھا۔معلوم ہوتا تھا حسن اور جوانی کی جیتی جاگی تصویر بیٹھی ہے۔

''میں آپ کی بیوی ہوں۔آپ پر میرا پورا ادھیکار ہے۔آپ مجھ سے دور نہ رہئے۔''

شیام صرف چنچلا کو دیکھتا رہا۔واقعی وہ بہت خوبصورت تھی۔وہ جتنی حسین ہے اس کا دل بھی اتنا ہی سندر ہوگا۔شیام نے سوچا۔

''تمہارے من میں کیا چل رہا ہے؟''——شیام نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''بتا دوں؟''

''ہاں بتاؤ نا!''——

''بتا دوں؟''

''ہاں بتا دو!''

''واقعی بتا دوں؟''

''ہاں!''

چنچلا نے بیڈ سوئچ آف کر دیا اور شیام کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔شیام دھیرے دھیرے اس کی طرف جھکتا چلا گیا اور چاند آہستہ آہستہ بادل میں روپوش ہونے لگا۔

وصل کے بعد دوشیزگی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے جب چنچلا تیار ہو کر ناشتے کے لئے ڈائننگ ٹیبل کے پاس آئی تو سبھی بھائی اسے ایک ٹک دیکھتے رہے۔

''اتنی سندر.........''

سبھی کے دلوں میں خواہشوں کا چراغ جل اٹھا۔

دوسری رات شیام کچھ بجھا بجھا چنچلا کے کمرہ میں آیا۔ چنچلا نے اس کے چہرے کو دیکھا——

''کیا بات ہے........آج آپ بجھے بجھے سے لگ رہے ہیں؟——چنچلا نے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''آج میں تمہارے ساتھ نہیں سو سکوں گا''——شیام نے یہ جملہ مدھم آواز میں اس طرح ادا کیا جیسے الفاظ اس کا ساتھ نہیں دے رہے ہوں۔

''تو پھر؟''——چنچلا نے زور سے پوچھا۔

''آج رات........''

''ہاں بولو نا!''

''آج رات........آج رات........''

''ہاں بولو نا آج رات........''

''میری ہمت نہیں ہو رہی ہے۔ میری زبان یہ الفاظ ادا کرنے سے نہ جانے کیوں لڑکھڑا رہی ہے۔''

''شیام جو بھی کہنا ہے کہہ دو........ ہاں بولو آج کی رات........''

''آج کی رات........بڑے بھیا تمہارے کمرہ میں سو........سو........سوئیں گے۔''

''کیا؟'' ....تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو۔ اپنی پتنی کو........''چنچلا تقریباً چیخ پڑی۔

''چنچلا ہمارے پریوار کی یہی پرمپرا ہے۔ ایک بھائی شادی کرتا ہے لیکن وہ سبھی بھائیوں کی پتنی ہوتی ہے۔''

''نہیں ....ایسا نہیں ہو سکتا........میں یہ کام ہرگز نہیں کر سکتی ....میں پانچ بھائیوں کی پتنی بن کر اس گھر میں نہیں رہ سکتی ....میں ابھی اس گھر کو چھوڑ کر جا رہی ہوں........شادی سے پہلے تم نے مجھے یہ سب کیوں نہیں بتایا تھا؟''

''اگر بتا دیتا تو آج کے جگ میں کوئی بھی لڑکی شادی کرنے کو تیار نہیں ہوتی۔''

''تو کیا تم سمجھتے ہو کہ میں پانچوں بھائیوں کے ساتھ رات گزارنے کے لئے تیار ہو جاؤں گی۔''

''چنچلا تمہیں ایسا کرنا ہی ہوگا''——یہ کہہ کر شیام کمرہ سے باہر آ گیا۔ چنچلا ایک بے جان مردہ کی طرح دھم سے پلنگ پر گر گئی۔

رات کی سیاہی میں وقت اپنا کھیل کھیلتا رہا اور چنچلا وقت اور حالات کے ہاتھوں چکی کے دونوں پاٹوں کے درمیان پستی رہی۔

ایک رات

دو رات

تین رات

چار رات

اور پانچویں رات پھر شیام اس کے کمرہ میں آیا مگر چنچلا ایک دم ٹوٹ کر رہ گئی تھی۔ ذہنی طور پر بھی اور جسمانی طور پر بھی۔ وہ وہاں سے

بھاگ جانا چاہتی تھی مگر بھاگ کر جاتی کہاں سارے راستے بند ہوگئے تھے۔ پیروں میں سماج نے بیڑیاں ڈال دی تھی جسے توڑ پانا ممکن نہیں تھا۔ وہ گھٹ گھٹ کر جی رہی تھی۔ جیسے ناحق اسے جینے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ اسے اپنے وجود سے نفرت ہونے لگی.........وہ زندہ ہی کیوں ہے؟.........اس نے لڑکی کے روپ میں جنم ہی کیوں لیا؟.........وہ پیدا ہوتے ہی مر کیوں نہیں گئی......... یا اس کی ماں نے کوکھ میں ہی کیوں نہ مار دیا——جس طرح آج کل پتا چلتے ہی لڑکی کو کوکھ میں ہی مار دیا جاتا ہے۔ بہت سارے سوال اس کے معصوم ذہن میں ابھرتے اور جواب نہ پا کر اسے پریشان کرتے۔ اب اسے شیام سے وہ محبت نہ رہی تھی بلکہ اس سے نفرت کرنے لگی تھی۔ اس نے مجھ سے شادی کیوں کیا تھا۔ وہ گھر میں رہتی مگر اس کا ذہن نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتا رہتا۔ جس طرح کوکھ میں لڑکیوں کو مارا جا رہا ہے۔ آنے والے وقت میں کیا میری طرح ہی تین، پانچ یا دس مردوں کی بیوی بن کر رہنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔

شیام نے شدّت سے محسوس کیا کہ چنچلا اس سے ناراض رہتی ہے۔ ٹھیک سے بات بھی نہیں کرتی نہ اس کا رویہ اس کے تئیں بہتر ہوتا لیکن شیام چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنے پریوار کی پرمپرا کا دھرم نبھا رہا تھا لیکن اس کے دل میں یہ کسک ضرور تھی کہ اس کی بیوی سبھی بھائیوں کی بیوی بن کر جی رہی ہے جب کہ شادی اس کے ساتھ ہوئی ہے۔ اس لئے چنچلا پر صرف اس کا ادھیکار ہے لیکن اس ادھیکار کو حاصل کرنے کے لئے اسے نہ صرف اپنی پرمپرا کو توڑنا ہوگا بلکہ بغاوت بھی کرنی ہوگی۔ ایک لڑائی لڑنی ہوگی مگر اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اپنے بھائیوں سے بغاوت کے بارے میں سوچ بھی سکے۔

چنچلا اور شیام کا تعلق ہی کچھ عجیب سا ہو گیا ہے۔ شیام چنچلا کو کیسے سمجھائے کہ تم میری دھرم پتنی ہو مگر صرف اپنی بیوی کہہ نہیں سکتا کہ تم پانچوں بھائیوں کی بیوی بن گئی ہو.........جو کچھ بھی ہوا اس پہ نہ زور میرا ہے اور نہ تمہارا بلکہ یہ سارا کھیل نصیب کا ہے۔ مقدر کے دائرے میں ہم تم اس طرح الجھ گئے ہیں کہ کسی بھی طرح نکل نہیں سکتے۔ چنچلا میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ ذرا سی ٹھیس لگتے ہی شیشہ ٹوٹ جاتا ہے——شیام کی آنکھ سے آنسو چھلک آئے۔

زندگی ایک دائرہ ہی تو ہے۔ زمانہ خود کو دہراتا رہتا ہے۔

چنچلا کو پتہ چلا کہ وہ حاملہ ہے تو اندر تک کانپ گئی۔ روشنی کے چہرے پر تیرگی کے ناخن کے سیکڑوں خراشیں پڑ گئیں۔ وہ اس بچے کو جنم دینا نہیں چاہتی تھی۔ پتہ نہیں کس بھائی کا بچہ ہے۔ اس کی سسکیاں سکوت شب میں سینہ چیر دیتی ہیں۔ وہ رات بھر پریشان رہی آج شام سے ہی اس نے دروازہ بند کر لیا تھا اور کسی بھائی کو اس کے کمرہ میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ کوئی اہم فیصلہ کرنا چاہتی تھی۔ آخر اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔ شیام کو کسی طرح اپنے فیصلے میں شامل کر لیا اور ڈاکٹر کے پاس جا کر حمل ضائع کروا دیا۔ شیام کو تھوڑی دیر کے لئے افسوس تو ہوا لیکن چنچلا نے اسے سمجھایا——

''شیام میں صرف تمہارے بچے کی ماں بننا چاہتی ہوں.........میرے پیٹ میں کس بھائی کا بچہ پل رہا تھا مجھے خود نہیں معلوم اس لئے کہ کبھی کبھی ایک رات میں تمہارے کئی بھائی میرے پاس آتے تھے۔''

شیام کو بھی شدّت سے اس بات کا احساس ہونے لگا کہ چنچلا کے ساتھ جو ہو رہا ہے وہ اچھا نہیں ہو رہا ہے۔ وہ درختوں کے ٹوٹے پتوں

کی طرح کچھ دیر تک ہواؤں کے آغوش میں جھولتا رہا۔ وہ چنچلا کی اداسی نہیں دیکھ سکتا تھا مگر وہ کوئی بھی فیصلہ لینے سے قاصر تھا۔

چنچلا نے جب حمل ضائع کرنے میں شیام کی مدد لی تو اسے یقین ہوگیا کہ وہ شیام کو رام کرسکتی ہے۔ اس لئے آہستہ آہستہ اس نے محبت اور حسن اخلاق سے اس کا دل جیت لیا۔ اسے ہر وقت یہ احساس دلاتی کہ وہ صرف اس کی بیوی بن کر جینا چاہتی ہے۔ مجھے یہ آرام و آرائش نہیں چاہئے میں کٹیا میں رہ کر دال روٹی کھا کر بھی زندگی گزارلوں گی مگر میں یہ اذیت بھری زندگی نہیں جی سکتی۔ تم پڑھے لکھے سمجھدار ہو اس لئے فیصلہ تمہیں کرنا ہے کہ تم مجھے کیسی زندگی دینا چاہتے ہو۔ یہ اذیت بھری زندگی یا ایک خوش حال زندگی، فیصلہ جلد کرو کیوں کہ میں ہر روز قطرہ قطرہ مر رہی ہوں۔ مجھے قطرہ قطرہ مرتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہو یا ایک باوقار زندگی دینا چاہتے ہو۔

شیام تذبذب میں تھا وہ کیا فیصلہ کرے۔ یہ سب کچھ چھوڑ کر چلا جائے یا گھٹن بھری زندگی جینے کے لئے آمادہ ہو جائے۔ وہ کئی راتوں سے سویا نہیں تھا۔ اسے ہر لمحہ چنچلا کی فکر ستاتی رہتی۔ وہ چنچلا کے لئے کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن اتنا بڑا فیصلہ لینے میں اسے دشواری ہو رہی تھی۔ سبھی بھائی اس سے بڑے تھے۔ سارا بزنس، کھیت، روپیہ، پیسہ ان کے قبضے میں تھا وہ آج تک صرف اپنی ضرورت کے لئے ہی پیسے مانگتا لیکن وہ کچھ کرنا چاہتا تھا۔ کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتا تھا۔ بالآخر اس نے فیصلہ کر ہی لیا۔

ایک رات جب چاروں بھائی نیند کے آغوش میں پینگیں لے رہے تھے۔ شیام چنچلا کو لے کر گھر سے باہر آ گیا۔ اس نے حسرت بھری نگاہوں سے گھر کو دیکھا مگر چنچلا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''چلئے! آج سے ایک نئی زندگی کی شروعات کرتے ہیں۔''

دونوں اپنا بریف کیس لئے آہستہ آہستہ اسٹیشن کی طرف بڑھنے لگے۔

●●

رام رام سادھو نے دونوں ھاتھ جوڑ کر آنکھیں بند کرتے ھوئے گردن آسمان کی طرف اٹھا لی۔

"یہ دیوی بڑی الھڑ ھے۔ یہ بھگوان کے درشن سے ڈر گئی۔

پھر نہ جانے وہ کیا پڑھتا ھوا ھجوم میں گھس کر عورتوں کو اندر بلانے لگا۔

رتـنـمّـا ۔ رتنمّا۔ میں نے جھک کر بے سدھ رتنمّا کو اپنی بانھوں میں سنبھالا۔ اس وقت مجھے یاد ھی نہ رھا کہ اس مندر میں قدم رکھنے سے بھگوان روٹھ جائیں گے۔ ان کے کعبے کی جالیوں کو چھونے کا شرف مجھے کبھی نھیں ملے گا۔

رتـنـمّـا کی خالہ بھی گھبرا گئیں۔دنتا اور راجو نے جلدی جلدی اس کی ساری ٹھیک کی ' منہ پر بکھرے بال ھٹائے اور اسے جھنجھوڑنے لگی۔ رتنمّا۔ رتنمّا۔

"اب میں گھر نھیں جاؤنگی۔" اس کی گردن میرے کاندھے پر سے ڈھلکنے لگی۔

"مجھے نروان مل گیا ھے۔"

شاید آپ بھول گئے ھوں؟

یہ اس دن کی بات ھے جب حوس اور بدی کے پتلے کو آگ لگا دی گئی تھی۔

(افسانہ "نروان"، جیلانی بانو)

میں دامنی نہیں ہوں

شام نے اپنے چہرے پر کالک مل کر مزید سیاہ کرلیا۔رات دھیرے دھیرے اپنا پاؤں پھیلانے لگی۔رات جب آتی ہے تو دن بھر کا تھکا ماندا انسان اپنی تکان مٹانے کے لئے اپنے تھکے بدن کو بستر پر پھیلا کر آرام کی نیند سو جاتا ہے مگر شہر کے کچھ علاقے ایسے ہوتے ہیں جو بارہ بجے کے بعد جاگتے ہیں۔شیواجی اسٹیڈیم سے لے کر گول مارکیٹ کی سڑک بارہ بجے کے بعد جاگ جاتی ہے۔جسم بیچنے والی عورتیں زرق برق لباس میں گہرا میک اپ کئے رکشے پر سوار شیواجی اسٹیڈیم سے لے گول مارکیٹ کی سڑک پر گھومتی رہتی ہیں۔خواہش مند حضرات رکشہ روک کر اس عورت سے بات کرتے ہیں۔سودہ طے ہو جانے پر وہ عورت یا تو موٹر سائیکل پر بیٹھ کر یا کار میں بیٹھ کر اس کے ساتھ روانہ ہو جاتی ہے رات بھر جاگنے کے لئے' ایسی عورتوں کے لئے رات سونے کے لئے نہیں جاگنے کے لئے ہوتی ہے۔جاگنا اس کا مقدر ہوتا ہے۔کاتب وقت نے دی ہے اسے جاگنے کی سزا۔دوہ جاگ رہی ہے اور رات آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں موندرہی ہے۔

آج کی رات بھی سو رہی ہے اور ساتھ ہی شیواجی اسٹیڈیم کا علاقہ بھی سو رہا ہے۔اس علاقے میں پولس کی گشت بڑھا دی گئی ہے۔مارے خوف کے وہ عورتیں آج گھر سے باہر نہیں نکلی ہیں۔ضرورت مند حضرات آدھی رات کے بعد ایسی عورتوں کی تلاش میں نکلے مگر ناکامی ہاتھ لگی۔

ایک کار میں چار نوجوان ایسی عورتوں کی تلاش میں دلّی کی سڑکوں پر کار دوڑاتے پھر رہے ہیں لیکن ہر جگہ ناکامی کا چراغ بجھتا نظر آ رہا ہے۔رات آہستہ آہستہ اپنے پیر پھیلا رہی ہے۔ان نوجوانوں کی شدّت میں مزید اضافہ ہوتا جارہا ہے۔شراب کی کئی بوتلیں خالی کر چکے ہیں لیکن جسم کو حاصل کرنے کا نشہ دماغ میں کیڑے کی طرح کلبلا رہا ہے۔اچانک ان کی نظر سڑک کے کنارے کپڑے کو ڈال کر جو آشیانہ بنایا گیا تھا اُس پر پڑتی ہے۔ان میں سے ایک نوجوان نے کہا——

''راہل گاڑی روکو!''——راہل نے گاڑی روک دی۔

''اترو!''——سنجے نے کپل اور مونٹی سے کہا۔

تینوں کار سے اتر گئے۔

''دیکھو سامنے والی جھونپڑی میں ضرور کوئی لڑکی مل جائے گی''——سنجے نے جھونپڑی کی طرف اشارہ کیا۔

’’لیکن اس میں تو ریڈ لائٹ پر بھیک مانگنے والی بھکارن رہتی ہے‘‘ —— کپل نے حقارت سے کہا۔

’’ذات بھکاری کی ہو لیکن جسم تو سبھی عورتوں کا ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔ رات گزارنے سے مطلب۔ جسم چاہے بھکارن کا ہو یا شریف زادی کا سب ایک ہی مزہ دیتا ہے‘‘ —— سنجے آگے بڑھا اور کپڑے کا پردہ اُوپر کی طرف الٹ دیا۔ اندر جھونپڑی میں ایک ادھیڑ عمر عورت اور اس کی جواں سال بیٹی سو رہی تھی۔ دونوں جاگ گئیں۔

’’کون ہے؟‘‘ —— ادھیڑ عمر عورت سکھیا نے چونک کر کہا۔ اس کی آواز سن کر اس کی بیٹی سگنی بھی جاگ گئی۔

’’کون ہے ماں؟‘‘

سنجے نے ٹارچ جلا کر دونوں ماں بیٹی کو دیکھا اور کہا ——

’’کپل لڑکی کو اٹھاؤ اور کار میں ڈالو‘‘ ——

یہ جملہ سن کر دونوں ماں بیٹی سہم گئیں دوسری طرف کا پردہ ہٹا کر سگنی جھونپڑی سے باہر آ گئی اور سنسان سڑک پر بے تحاشہ بھاگنے لگی۔ سنجے، کپل اور مونٹی اس کے پیچھے بھاگے۔ کچھ ہی دور جا کر تینوں نے سگنی کو دبوچ لیا۔ راہل نے کار اس کے پاس ہی روکا، تینوں نے زبردستی اسے کار میں ڈالا۔ وہ چیخ رہی تھی مگر ان لوگوں نے اس کا منھ بند کر رکھا تھا۔ بعد میں منھ پر کپڑا باندھ دیا لیکن اس کے جسم کو کپڑے سے آزاد کر دیا اور چاروں مل کر اس کے جسم کو چیل کوے کی طرح نوچتے رہے اور جب نوچ نوچ کر سیر ہو گئے تو کار سے نیچے سڑک پر پھینک دیا۔ سگنی کا پورا جسم خوف سے کانپ رہا تھا۔ جگہ جگہ سے خون رس رہے تھے۔ وہ برہنہ پڑی تھی۔ رات بھر اسی طرح برہنہ پڑی رہی اگر کبھی کبھی کوئی کار یا بائیک والا اس سڑک سے گزرتا تو وہ بھی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ اس کی ماں سکھیا رات بھر سڑکوں پر اپنی بیٹی کو تلاش کرتی رہی اور جب وہ صبح میں ملی تو رات اپنی سیاہی چھپا کر روپوش ہو گئی تھی لیکن سگنی دنیا سے روپوش ہو گئی تھی۔ سکھیا نے اپنی ساڑی اتار کر اس کے ننگے جسم پر ڈال دیا اور چلانے لگی۔

’’ظالموں نے میری بیٹی کی عزت لوٹ کر مار ڈالا......... مار ڈالا حرامزادوں نے ....عزت کے ساتھ جان بھی لے لی میری بیٹی کی‘‘ ——

سڑکوں پر آمد و رفت شروع ہو گئی تھی لیکن کوئی بھی اس کی آواز سننے کو تیار نہیں تھا۔ کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کی لاش اٹھائے پولس اسٹیشن پہنچ گئی۔

’’حضور، چار رئیس زادوں نے میری بیٹی کو میری جھونپڑی سے اٹھا کر لے گئے۔ اس کی عزت بھی لوٹی اور جان سے مار بھی ڈالا‘‘

انسپکٹر ہنسا —— ’’اب تم لوگوں کی بھی عزت رئیس زادے لوٹنے لگے۔ بس میں کوئی اکیلی لڑکی نہیں ملی جو تمہاری بیٹی کو اٹھا لیا۔ دلّی میں نہ جانے کتنی لڑکیا بس میں اکیلی سفر کرتی مل جائیں گی۔ اب تم لوگوں کے لئے بھی پولس حرکت میں آ گئی تو ان شریف لڑکیوں کی رپورٹ کون لکھے گا جو ہر روز لٹ رہی ہیں۔ ان کی تفتیش کون کرے گا؟.........چل بھاگ یہاں سے ....سڑک کے کنارے لاش کو رکھ دینا.........لوگ ترس کھا کر ہزار پانچ سو روپیہ دے ہی دیں گے۔ اسی سے جلا دینا۔‘‘

سکھیا اپنی بیٹی کی لاش لے کر ایک میڈیا والے کے پاس گئی۔

''آپ تو میڈیا والے ہیں.........میری بیٹی کی عزت لوٹی گئی اور اسے جان سے بھی مار ڈالا ظالموں نے.........آپ اپنے چینل پر اس رپورٹ کو دکھایئے تا کہ میرے ساتھ انصاف ہو سکے.........ظالموں کو سزا مل سکے''

میڈیا والا زیر لب مسکرایا——— ''تیری بیٹی کوئی دامنی تھوڑی ہی تھی یا اسکول میں پڑھنے والی وہ کم سن لڑکی بھی نہیں تھی جس کی عزت لوٹی گئی ہے۔ تیری عزت کی قیمت ہی کیا ہے جو خبر بناؤں.........تمہاری رپورٹ سے میرے چینل کا ٹی۔آر۔پی۔بھی نہیں بڑھے گا.........جاؤ، اس لاش کو جلانے کا انتظام کرو۔ میری طرف سے یہ سو روپیہ رکھ لو، لاش کو جلانے میں کام آئے گا۔''

سکھیا نے وہ روپیہ تو نہیں لیا البتہ اپنی بیٹی کی لاش لئے ایک لیڈر کے پاس پہنچ گئی۔

''حضور میری بیٹی کی عزت.........اور جان.........''

لیڈر کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے سکھیا کی طرف دیکھا———

''اگر تمہاری جیسی عورتوں کو پولیٹیکل اِشو بنایا گیا تو کتنی جنتا میرے ساتھ اترے گی۔ دامنی میڈیکل کی چھاترا تھی اس لئے لوگوں کی ہمدردی اس کے ساتھ تھی۔ پورے ہندوستان میں تحریک نے زور پکڑا اور سرکار کو قانون تک بنانا پڑ گیا.........نہیں نہیں.........تمہارے اِشو پر ہم کوئی تحریک نہیں چلا سکتے.........جاؤ اور اس کا انتم سنسکار کرو.........لو میری طرف سے یہ پانچ سو روپیہ رکھ لو.........بھگوان تمہاری بیٹی کی آتما کو شانتی دے.........''

لیڈر اندر کمرے میں چلا گیا اور آپ ہی آپ بُد بُدایا——— ''یہ شریف زادے بھکارن کو بھی نہیں بخشتے.........اگر اتنا ہی جوش چڑھا تھا تو کسی ہوٹل میں چلے جاتے.........رام رام کیسا جُگ آ گیا ہے.........''

مجبوراً سکھیا روہانسی ہو کر لاش کو اپنی جھونپڑی کے قریب سڑک پر رکھ کر ایک چادر سے ڈھک دیا اور پاس ہی بیٹھ کر رونے لگی۔ اس کی برادری کے چند لوگ بھی اب اس کے پاس آ گئے تھے اور لاش کو جلانے کے بارے میں آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

پیدل چلنے والے مسافر اس لاش کو دیکھتے۔ روتی بلکتی ماں کو دیکھتے اور اپنی جیب سے کچھ سکے اس لاش پر اچھال کر آگے بڑھ جاتے۔

●●
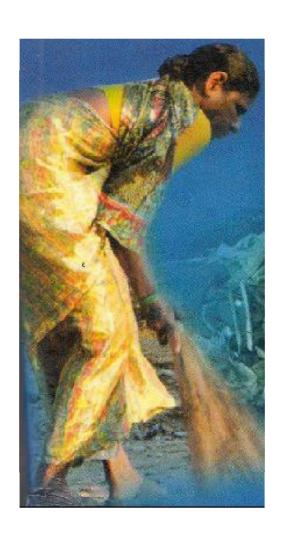
اسّی روپئے!اسّی روپئے کی پتلون! اسّی روپئے پگار!
جات پات کی گندگی کو تو زنجیر کھینچنے سے پانی کا ریلا بہا کر لے گیا لیکن اسّی روپئے پگار کے کلنک کو دھونے کے لئے کون سا گنگا جل دھو سکتا ہے؟ چائے پی کر پیالی واپس کرتے ہوئے اس نے سوچا۔ بمبئی میں چائے دیتے وقت جات پات نہیں پوچھتا لیکن بیٹی کو کسی چھوکرے کے ساتھ سنیما بھیجنے سے پہلے جات پات بھی پوچھتے ہیں اور پگار بھی۔

(افسانہ "ٹیری لین کی پتلون"، خواجہ احمد عباس)

اووَرٹائم

پھر کہیں سے سنسناتا ہوا اندھیرا اُس کے وجود کے اوپر سے گزرنے لگا' اس اندھیرے کی ہیبت ناک موجیں اُس کو روندتی چلی جارہی تھیں کہ دفعتاً اُس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ سوگئی تھی یا شاید کوئی جھپکی آگئی تھی یا پھر نینداور بیداری کے درمیان وہ کہیں کھوگئی تھی' کچھ دیر کے لیے!
—— کھڑکی سے مدھم چاندنی کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ اس نے لیٹے لیٹے چاند کی جانب سر گھما کر دیکھا۔ ایک بے جان سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بکھر گئی۔ ایک اس کا بھی تو چاند ہے جسے بادلوں نے ڈھک لیا ہے—— اُس نے آنکھیں بند کرلیں۔ گہرے اندھیرے میں ٹوٹتی بکھرتی سی سفید لکیریں اس کی آنکھوں میں کوئی شبیہ بناتی گزر جاتی ہیں—— یہ کس کی شبیہ ہے؟——

''بھیکو!''—— اس کے تصور میں یہ نام کئی بار چمکتا ہے اور اُمید کی لَو سر اُٹھاتی ہے کہ بھیکو اچانک اپنے بستر سے اُٹھے گا اور اپنی مضبوط بانہوں میں اسے جکڑ لے گا—— اس نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں اور بھیکو کے بستر کی طرف دیکھا—— لیکن بھیکو گہری نیند میں سویا ہوا تھا۔ اس نے پھر آنکھیں بند کرلیں۔ اس کی آنکھوں کے کنارے پوری طرح بھیگ چکے تھے——'

رنجیت سنگھ کی حویلی میں داخل ہونے سے پہلے گلبیا ذرا **جھجکی** تھی—— اس نے سینے پر آہستہ سے ہاتھ رکھ لیا تھا۔ دھڑکنیں بڑھ گئی تھیں۔ بس اطمینان کی بات یہی تھی کہ بھیکو اس کا پتی اس کے ہمراہ تھا جو اپنے مالک سے ملوانے اسے لے جارہا تھا۔ گلبیا آس پاس قرینے سے سجی تمام چیزوں کو دیکھتی بھی جاتی تھی اور من ہی من خوش بھی ہو رہی تھی کہ اس کا پتی اتنے بڑے گھر میں کام کرتا ہے——'

کمرے میں رنجیت سنگھ بیٹھے تھے۔ انہوں نے قریب کھڑی گلبیا کو دیکھا اور مسکرائے——'

''مالک یہ گلبیا ہے' گلبیا!—— ''مالک کے پیر چھو کر آشیر واد لے۔''

گلبیا پیر پر جھک گئی۔ رنجیت سنگھ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

''سدا سوبھاگیہ وتی رہو''—— پھر سو سو کے دو نوٹ نکال کر انہوں نے اس کی طرف بڑھائے—— ''یہ رکھ لو——''

—— گلبیا نے اپنی کوٹھری کو دیکھا۔ یہی اس کی جنت تھی۔

''گلبیا تم کو مالک کیسے لگے۔؟''—— بھیکو ایک طرف بیٹھتا ہوا بولا۔

''میں تو ڈر کے مارے ان کو ٹھیک سے دیکھ بھی نہ پائی!''—— گلبیا زور سے ہنسی——'

''مالک اور مالکن دونوں بڑے دیالو ہیں' ای جو ساڑی تو پہنے ہے انہوں نے ہی دیا ہے۔ پھر سادی میں کھرچ کے واسطے روپیہ بھی دیا تھا——''

دھیرے دھیرے گلبیا بھی اس حویلی کا ایک حصہ بن گئی۔ اس کا زیادہ وقت کوشلیا کے پاس گزرتا۔ جب کہ بھیکو دن بھر گھر کے کام کاج میں مصروف رہتا۔ رات دونوں کی اپنی ہوتی۔ گلبیا کو بھیکو کا اتنا کام کرنا ایک آنکھ نہ بھاتا۔ وہ دل مسوس کر رہ جاتی۔ اس نے بھیکو کا کام ہلکا کرنے کے لیے رنجیت سنگھ کے کمرہ کی صفائی بھی اپنے ذمہ لے لی تھی۔ تب ہی اس نے یہ محسوس کیا کہ رنجیت سنگھ کی نگاہیں اس کے چاروں طرف چکر لگاتی رہتی ہیں۔ پہلے تو اس نے اس پر زیادہ دھیان نہیں دیا مگر پھر اس کی چھٹی حس بیدار ہوگئی اور ایک انجانے خوف سے گلبیا کا دل رہ رہ کر دھڑکنے لگا——'

ایک دن مالکن بھیکو کو لے کر دوسرے گاؤں گئی تو رات میں بھی نہ لوٹی۔ اس رات گلبیا رنجیت سنگھ کا بستر ٹھیک کر کے لوٹ رہی تھی تو رنجیت سنگھ نے اسے روکا——

''گلبیا! آج تو یہیں سوئے گی!''

''مالک ای کا کہہ رہے ہیں؟ ای پاپ ہے۔''

''پاپ اور پنیہ کے چکر میں تم کیوں پڑتی ہو۔ یہ ہم پر چھوڑ دو۔''

''مالک ہم پر ترس کھائیے۔ ہم ایسا نہیں کر سکتے۔''

''تو ڈرتی کیوں ہے ہم جو تیرے ساتھ ہیں۔''

''نہیں ہم بھیکو کے سوا دوسرے مرد کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے مالک۔''

''میرے ساتھ ایک رات سو جانے سے تو بھیکو سے تھوڑے ہی الگ ہو جائے گی۔ کہلائے گی تو بھیکو کی ہی پتنی۔''

رنجیت سنگھ اس کی طرف بڑھتا ہے لیکن گلبیا نکل بھاگتی ہے اور اپنی کوٹھری میں پہنچ کر دروازہ بند کر لیتی ہے۔ وہ رات بھر روتی رہتی ہے اور ہر آہٹ پر چونک اٹھتی ہے——'

دوسرے دن بھیکو آجاتا ہے تو گلبیا لٹک جاتی ہے کہ گاؤں لوٹ چلا جائے۔

''اب میں اس گھر میں نہیں رہوں گی۔ مجھے یہاں سے لے چلو''——

''کیا بات ہے؟ ایسی کیا بات ہوگئی کہ تم نے جانے کا سوچ لیا؟''——بھیکو متعجب ہو کر پوچھتا ہے۔

''تم باہر چلے جاتے ہو تو اکیلے مجھے ڈر لگتا ہے۔''

''اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ یہاں مالک مالکن ہیں اور گھر میں اور بھی تو نوکر چاکر ہیں۔''

''تمہاری بات اور ہے' اور ویسے میرا دل اب یہاں نہیں لگتا—— ہم لوگ اپنے گاؤں میں محنت مجوری کر کے پیٹ بھر لیں گے مگر یہاں نہیں رہیں گے۔''

''گلبیا اگر کوئی اور بات ہے تو بتاؤ ہم سوچیں گے مگر یہ اچانک جانے کی بات؟''

''میں نے کہہ دیا کہ نہیں رہوں گی۔ تم چلتے ہو یا نہیں؟''——

بھیکو گلبیا کا تیور دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

''ٹھیک ہے چلوں گا۔ مالک اور مالکن سے بول کر آتا ہوں۔ پیسے بھی تو لینے پڑیں گے۔ کرایہ تو لگے گا نا!——''

بھیکو نہیں جانا چاہتا تھا۔ کتنا آرام تھا اسے یہاں پر۔ صرف کام ہی تو کرنا پڑتا تھا۔ پیٹ بھرنے کے لئے کام تو کہیں بھی کرنا ہی پڑے گا۔

بھیکو رنجیت سنگھ کے پاس پہنچتا ہے۔

''مالک گلبیا گھر جانا چاہتی ہے کچھ روپیہ دے دیجئے——''وہ نظر نیچی کئے بولتا ہے۔

''اتنی جلدی——؟ ابھی اسے آئے کئے دن ہوئے ہیں؟''

''مالک جد کر رہی ہے تو ہم کا کریں۔''

''تم اسے سمجھاؤ۔ یہاں اسے کوئی تکلیف ہے یا کسی سے کوئی شکایت ہے؟''

''مالک ہم نے تو بہت سمجھایا مگر اوہمری بات مانتی نہیں۔''

رنجیت سنگھ خاموش ہو جاتے ہیں اور کچھ سوچنے لگتے ہیں۔

''ٹھیک ہے پہنچا دو مگر تم تو پہنچا کر آؤ گے نا؟''

''مالک......... بات ای ہے کہ......... ہم......... گلبیا کے بنا نہیں رہ سکتے......... سو......... اب ہم لوگ اپنے گاؤں میں ہی مجوری کرنے کا فیصلہ کیا ہے''——بھیکو ڈرتے ڈرتے بولا۔

''بھیکو جب تم لوگوں نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میں روکنے والا کون ہوتا ہوں۔ جاؤ میرا آشیرواد ہمیشہ تم لوگوں کے ساتھ رہے گا۔''

''مالک......... کچھ روپیہ سے مدد کر دیتے''——بھیکو نظر نیچی کئے ہی بولتا ہے۔ رنجیت سنگھ بھیکو کو غور سے دیکھتے ہیں۔ بھیکو پشیمان دیکھائی دیتا ہے۔ وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد کہتے ہیں——

''دیکھو بھیکو ابھی تو میرے پاس روپیہ ہے نہیں، کل اتوار ہے، پرسوں سوموار کو بینک کھلے گا تو روپیہ نکالوں گا، تم لے لینا۔''

ٹھیک ہے مالک دو دن رک جاتے ہیں۔''——بھیکو اپنے **گمچھے** سے آنسو پوچھتا ہوا چلا جاتا ہے۔

بھیکو کے جانے کے بعد رنجیت سنگھ کے ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ نمودار ہوتی ہے اور وہ معنی خیز انداز میں سر کو جنبش دیتے ہوئے اندر چلے جاتے ہیں۔

دوپہر کا وقت تھا۔ کوشلیا ٹی۔ وی۔ کے سامنے بیٹھی پروگرام دیکھنے میں محو تھی، بدھنا باہر گائے بھینس کو چارہ ڈال رہا تھا اور گلبیا اپنی کوٹھری میں بیٹھی آنے والے کل کے تصورات میں کھوئی تھی کہ کس طرح وہ اپنی جھونپڑی کو سجائے گی اور بھیکو کے بیٹے کو پڑھائے گی لکھائے گی تاکہ

اس کی پتنی پر اس کا ملک بری نگاہ نہ ڈالے۔ وہ پڑھ لکھ کر ضرور کسی دفتر کا بابو بنے گا۔ بھیکو کی طرح وہ نوکر نہیں ہوگا۔ اگر بھیکو کی کمائی کم پڑی تو وہ بھی مزدوری کرے گی تاکہ اس کے بچے کسی حویلی کے بیگار نہیں بنیں——‘

اس کی سوچ کی لہریں پتہ نہیں کہاں کہاں بھٹکتی رہتیں کہ بدھنا نے ہانپتے ہوئے آکر بتایا کہ بھیکو کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ وہ ہسپتال میں ہے——

بھیکو کو رنجیت سنگھ نے صبح ہی صبح کسی کام سے دوسرے گاؤں بھیجا تھا۔ گلبیا بدحواس دوڑتی ہوئی حویلی کی طرف بھاگی۔ رنجیت سنگھ کوشلیا کو ایکسیڈنٹ کے بارے میں بتا رہے تھے۔ گلبیا ان کو دیکھ ٹھٹھک گئی اور روہانسی آواز میں ان سے پوچھا——

’’مالک کیا ہوا ہمرے بھیکو کو؟‘‘

’’اس کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ وہ ہسپتال میں ہے۔ جاؤ‘ جا کر دیکھ کر آؤ۔‘‘

گلبیا ہسپتال پہنچ جاتی ہے۔

بھیکو بری طرح حادثہ کا شکار ہوا تھا۔ کمر سے نیچے کا پورا حصہ پٹیوں سے ڈھکا ہوا تھا اور بھیکو ابھی تک ہوش میں نہیں آیا تھا——‘

دو ماہ تک گلبیا کو حویلی اور ہسپتال ایک کرنا پڑا۔ صبح دوادارو کے بعد گلبیا حویلی چلی جاتی۔ دن ڈھلے پھر ہسپتال کا ایک چکر لگاتی اور پھر ساری رات وہ زمین پر بھیکو کے پیتانے گزار دیتی۔ اس درمیان ایک دفعہ رنجیت سنگھ بھی ہسپتال آئے۔ ڈاکٹروں سے باتیں کرنے کے بعد وہ بھیکو کے پاس بھی آئے اور گلبیا کو ڈھارس دینے کی کوشش کی——

’’دیکھو گلبیا جو ہونا تھا سو ہوگیا۔ میں پوری کوشش کر رہا ہوں کہ بھیکو پوری طرح ٹھیک ہوکر آجائے۔ میں نے ڈاکٹر کو کہہ دیا ہے کہ کسی بھی حالت میں بھیکو کو ٹھیک ہوجانا چاہئے۔

’’مالک ہمرا بھیکو ٹھیک ہوجائے گا نا؟‘‘

’’ضرور ٹھیک ہوجائے‘ گھبراؤ نہیں۔‘‘

’’مالک ہم بھیکو کے بنا نہیں رہ سکتے۔‘‘——وہ رونے لگی۔

گاؤں واپس جانے کا خیال گلبیا کی کوٹھری میں ہی سسک کر دم توڑ چکا تھا۔ اب تو اسے بس یہی فکر تھی کہ کسی طرح بھیکو بالکل ٹھیک ہو جائے اور اس کا سہاگ برقرار رہے۔ کوشلیا کا رویہ کیا ہے‘ رنجیت سنگھ اسے کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان سب پر دھیان دینے کا ہوش کہاں تھا۔ حویلی سے لے کر ہسپتال تک کی دوڑ کے علاوہ اسے اب کچھ یاد نہیں آتا تھا——‘

ایک دن ہسپتال جانے سے پہلے وہ رنجیت سنگھ کے پاس گئی——

’’مالک! ڈاکٹر بابو دوا دینے میں بڑی دیری کرے ہیں۔ میری ناہی سنے ہیں۔ آپ بول دیتے تو ٹھیک ہوتا‘‘——وہ ہاتھ جوڑ کر گڑگڑائی۔

رنجیت سنگھ گلبیا کو غور سے دیکھتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھے اور گلبیا کے قریب آکر سرگوشی میں بولے——

''بھیکو ٹھیک ہو جائے گا میں ڈاکٹر کو بول دوں گا۔ بس تم کبھی کبھی ادھر آجایا کرو۔''——— انہوں نے اس کے کاندھے پر ایک ہاتھ رکھ دیا۔

''ما.........ما.........مالک.........!'' گلبیا سٹپٹا گئی۔ وہ رنجیت سنگھ کا ہاتھ جھٹک کر بھاگ جانا چاہتی تھی کہ اچانک اس کی آنکھوں کے سامنے ہسپتال کا وہ کمرہ آگیا جس کے ایک بیڈ پر بھیکو لیٹا گلبیا کی راہ تکا کرتا تھا۔ وہ کھڑی کھڑی رہ گئی۔ رنجیت سنگھ کا ہاتھ جھٹکنے کی بجائے اس نے بڑی بے بسی سے انہیں دکھا جو اس پر جھکے چلے آرہے تھے———!

بھیکو ہسپتال سے واپس ضرور آجاتا ہے مگر وہ بیساکھیوں کے بغیر نہیں چلتا۔ گلبیا اس کی خوب سیوا کرتی ہے اور ڈھارس بندھاتی ہے کہ ایک دن وہ اپنے سے چلنے لگے گا———''

رنجیت سنگھ کے یہاں گلبیا کی حاضری بنتی رہتی ہے۔ اکثر آدھی رات کو بھی بھیکو کے قریب سے اٹھ کر اسے رنجیت سنگھ کے پاس جانا پڑتا ہے۔ پہلے تو بھیکو نہ سمجھ سکا لیکن آہستہ آہستہ اسے بھی احساس ہو جاتا ہے کہ اس کی دوروٹی اور اس کا علاج گلبیا کے اووَرٹائم کی بدولت ہے۔

گلبیا اندر ہی اندر گھٹ رہی تھی۔ وہ ایک ایسے پرندہ کی مانند خود کو محسوس کرتی ہے جو صدیوں سے کسی پنجرہ میں مقید ہو اور جس کی رہائی کی اُمید نہ ہو۔ وہ اکثر سوچتی——— اب جو اس کا بیٹا ہوگا وہ بھی بھیکو کی طرح رنجیت سنگھ کی ہی غلامی کرے گا۔ وہ کبھی پڑھ لکھ نہیں سکے گا' کبھی دفتر کا بابو نہیں بن سکے گا۔ اس کی اپنی کوئی زندگی نہیں ہوگی بلکہ رنجیت سنگھ یا رنجیت سنگھ کے بیٹے کی بھیک میں دی ہوئی زندگی ہوگی۔ اس کی پتنی اگر اوورٹائم نہیں کرے گی تو اسے بھی بھیکو کی طرح ایک دن اپاہج بنا دیا جائے گا۔ اور تب اس کی پتنی رنجیت سنگھ کی حویلی میں اوورٹائم کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔ ابھی ابھی گلبیا حویلی سے نکل کر آئی تھی۔ بھیکو کے نزدیک بستر بچھا کر وہ لیٹ جاتی ہے۔ کھلی کھڑکی سے سفر تمام کرتے چاند کی شعاعیں کوٹھری کا اندھیرا دور کر رہی تھیں مگر گلبیا کے من کا اندھیرا دور کرنے کے لئے چاند کہاں سے آئے گا؟ اس کا چاند بے جان کیچوے کی طرح بستر سے لپٹا پڑا تھا———'

——— پھر کہیں سے سنسناتا ہوا اندھیرا اس کے وجود کے اوپر سے گزرنے لگا۔ اس اندھیرے کی ہیبت ناک موجیں اس کو روندتی چلی جارہی تھیں۔ اس نے محسوس کیا کہ ان ہیبت ناک موجوں کی لپیٹ میں بھیکو بھی ہے اور اس کے خواب بھی ہیں اور اب.........وہ موجیں اس راستہ پر آگے بڑھ رہی ہیں جو اس کے گاؤں کو جاتا ہے———!

●●
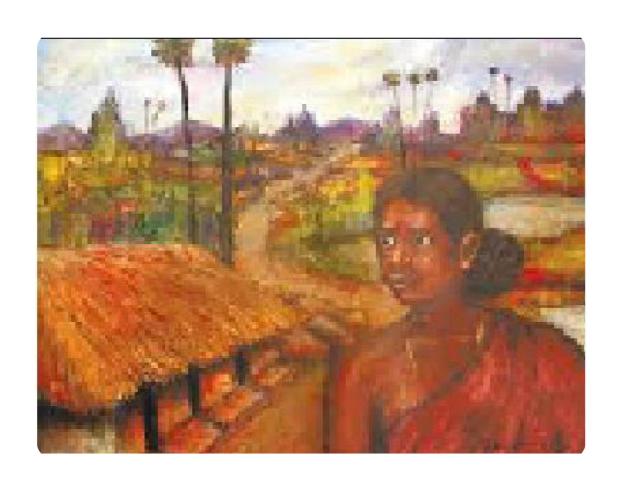
ہور سن۔ تیری ایك سزا یه بھی ہے که جب ہم ہور تیری جورو اندر رہیں تو دروازے پر ہی بیٹھا رہو پھر تیرا جی تو جلنا کی اندر تیری جورو کا کیا حشر ہو رہا ہے۔

کلوا کچھ نه بولا۔

پھر سرکار نے کھانا کھلانے والے خادم کو بلا کر زوردار الفاظ میں تنبیه کی " اب سے ہماری جھوٹن اس حرامزادے کو نکو دیتے۔ جاؤ بھوت حرام خور ہے انے۔ کھا کھا کر مستی چڑھ گئی ہے اس کو۔"

خوف کی زیادتی کبھی کبھار انسان کو بے خوف بنا دیتی ہے۔ اب کلوا پھلی بار بولا۔"ہو' آج سے میں اچ کار کی جھوٹن نئیں کھاؤں گا۔ کیونکه اب سرکار میری جھوٹن کھارئے۔"

بڑے سرکار کے ہاتھ سے بینت چھوٹ کر ان کے اپنے پیروں پر آ پڑا۔

(افسانه "جھوٹن"، واجده تبسم)

کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے

سایہ بہت گہرا ہو گیا ہے اور سامنے کی بیشتر چیزیں دھند میں ڈوب سی گئی ہیں۔ میں جو سینکڑوں میل کا لمبا راستہ طے کر کے اس گاؤں میں پہنچا ہوں تو میرے لئے ہر ڈگر، ہر راستہ، ہر چہرہ اجنبی بنا ہوا ہے!——

آسمان دھیرے دھیرے سیاہ بادلوں کے نرغہ میں گم ہوتا جا رہا ہے——اب تک میں کئی دروازوں پر دستک دے چکا ہوں مگر میرے لئے سب دروازے بند نظر آتے ہیں۔ کسی کسی کھڑکی کی اوٹ سے کوئی صورت اُبھرتی ہے مگر فوراً غائب بھی ہو جاتی ہے——'

میں کہاں چلا آیا ہوں؟——میری آواز جہاں تہاں سے ٹوٹ رہی ہے——اب لوٹ بھی نہیں سکتا۔ دس بارہ میل کا کچا راستہ طے کرو تو پھر پختہ سڑک' مگر اس اندھیری رات میں سواری بھی کہاں ملے گی؟ اس پر یہ مزید تاریک ہوتی رات' میں کہیں بھٹک نہ جاؤں——

اچانک ایک دروازہ کھلتا ہے اور ایک لڑکی کا چہرہ نمودار ہوتا ہے۔ ایک ڈری ڈری سی' سہمی سہمی سی لڑکی ہاتھ کے اشارے سے مجھے بلا رہی تھی۔ نہ جانے کیوں میں ذرا **جھجکتا** ہوں۔ اِدھر اُدھر نظر دوڑاتا ہوں اور پھر اس کے قریب پہنچتا ہوں۔ وہ دروازے میں ایک طرف ہو جاتی ہے اور میں اندر داخل ہوتا ہوں۔ اندر کھاٹ پر ایک بوڑھا لیٹا ہوا ہے۔ پھوس کی اس جھونپڑی میں ایک لالٹین اپنی مدھم روشنی بکھیر کر جھونپڑی والوں کی فراخ دلی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ وہ لڑکی دوسری طرف سے ایک کھاٹ لا کر بچھا دیتی ہے۔

''سہر سے آئے ہو؟''——اُس لڑکی نے سیدھا سوال داغا۔

''ایسے سمئے میں یہاں آنا ٹھیک ناہی ہے بابو!''——پھر وہ جھونپڑی کی دوسری طرف بنے چولھے کے پاس گئی۔ المونیم کی پلیٹ میں دو روٹی اور کدّو کی سبزی پروس کر لائی——''ہم گریب لوگ اس سے جیادہ کھانے کو کچھ نہیں دے سکتے۔ ہمرا بابا بیمار ہے۔ اُ کرا حصہ اِی ہے۔ او ہے بولا تو ہم دروجّہ کھولا اور کھانا پروسا۔''——

پھر لڑکی باہر سے ایک لوٹا پانی لے کر آتی ہے اور میرے سامنے رکھ دیتی ہے اور بوڑھے کے پیتانے بیٹھ جاتی ہے۔

میں نے اُس لڑکی کو غور سے دیکھا اور محسوس کیا کہ اُس کے کان باہر ہی لگے ہوئے ہیں۔ ایک بے نام سی بے چینی اُس کے اندر کروٹ بدل رہی ہے۔ وہ عام آواز اور آہٹ پر بھی چونک پڑتی ہے اور میری طرف دیکھنے لگتی ہے۔ میں کھانا کھانے لگتا ہوں۔

’’یہاں کس لئے آئے ہو بابو جی؟——— جانتے نہیں کل ہی یہاں بڑا کھون کھرابہ ہوا ہے‘‘——— وہ بوڑھے کی پھٹی ہوئی چادر درست کرتے ہوئے گویا بات چیت شروع کرتی ہے۔

’’میں اُسی کے بارے میں جانکاری حاصل کرنے آیا ہوں۔‘‘

’’کوئی اکھبار والے ہو گے؟ اِی کھبر چھاپو گے کہ اِی جگہ بڑا کھون کھرابہ ہوا ہے۔ پھوٹو بھی لے جاؤ گے۔ بس!——— اُکرا سے لوگ جی اُٹھتئی، گھر سب بن جات؟.....؟‘‘

مجھے لگا اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں اور میں بالکل نروس ہو گیا۔ میں نے جلدی سے کہا———

’’میں اخبار والا نہیں، کہانی کار ہوں، کہانی لکھتا ہوں۔‘‘

’’تو تم اس کھون کھرابے کی کہانی بناؤ گے۔ کا کا لکھو گے بابو جی؟‘‘——— وہ زور سے ہنستی ہے۔ اُس کی ہنسی میں بھی شعلے لپک رہے تھے۔ میں کھانا ختم کر چکا تھا۔ وہ میرے سامنے سے تھالی اور لوٹا اُٹھا کر لے جاتی ہے۔ میں نے پلٹ کر اُسے دیکھا۔ مجھے یہ لڑکی حالاتِ حاضرہ کا ایک بے حد مناسب عنوان نظر آئی۔ وہ واپس آ کر پھر میرے سامنے فرش پر بیٹھ گئی۔ بوڑھا بھی جاگ گیا تھا مگر اُس کی آنکھوں میں ویرانی صاف جھلک رہی تھی———‘

میں نے اُن ویران آنکھوں کو غور سے دیکھا تو مجھے بیتے ہوئے کل کی تصویریں ایک کے بعد دوسری گزرتی دکھائی دیں.........

سورج ابھی ابھی ڈوبا ہے۔ دھندلکا لمحہ لمحہ گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ لوگ باگ اپنے اپنے کام سے لوٹ کر گھروں میں روٹیوں کا انتظام کر رہے ہیں۔ تبھی دور سے لگاتار گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ لوگ دم سادھ لیتے ہیں اِدھر اُدھر دیکھنے لگتے ہیں۔ خوف گرم ہوا کی طرح گاؤں کے لوگوں کو چھو کر گزر جاتا ہے اور پھر تڑاتڑ گولیاں——— وحشت، خوف اور بے بسی کے خیمے نصب ہو جاتے ہیں۔ لڑکے بلبلا رہے رہے ہیں۔ عورتیں چیخ رہی ہیں اور بوڑھے کانپ رہے ہیں۔ آگ کی لپٹوں کا علم بلند کئے، پاگل ہوائیں گاؤں کے ایک بڑے حصہ کو اپنی زد میں لے لیتی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ظلم کی اس رات کے پاس دور دور تک اُجالے کے نام و نشان نہیں۔ سارے گاؤں میں وحشت کے پجاری، ننگے شیطانوں کا رقص جاری ہے۔ وقت کا دامن تارتار اور لہولہو ہے۔ عورت، مرد، بچے اِدھر اُدھر بھاگتے ہیں۔ کسی کو کسی کی فکر نہیں؟

اس بھیانک ستم زدہ رات کا انت کہاں ہے؟ کب تک یہ کلاس وار ہوتا رہے گا؟——— اس طرح کے اسٹرگل میں آدمی ہی تو مرتا ہے۔ آدمی خواہ کسی کلاس کا ہو آدمی آدمی ہوتا ہے۔

ایک عورت درد کی شدت سے آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ جسم سے ٹپک کر لہو اُس کے کپڑوں کو سُرخ کر دیتا ہے۔ درد کی شدت لمحہ لمحہ بڑھتی جاتی ہے اور وہ گہرے بے رحم اندھیرے میں اپنے وجود کو محفوظ رکھنے کی کوشش میں ایک گرتی دیوار کی زد میں آ جاتی ہے اور وہ بوڑھا جو اس وقت سامنے کھاٹ پر لیٹا موت سے لڑنے کا حوصلہ رکھتا ہے وہ بھی اُسے نہیں بچا پاتا———! ملبے کا ڈھیر بنا گاؤں اُس کی آنکھوں سے منتقل ہو کر میرے تصوّر میں محفوظ ہو جاتا ہے۔ مضطرب اور بے چین دل میرے سینہ میں بڑی تیزی سے دھڑکنے لگتا ہے۔ اُس عورت کی آخری چیخ

کتنی بھیانک تھی۔ اُس چیخ کو ریڈیو یا ٹیلی ویژن کی برقی لہریں دور دور تک نہیں پہنچا ئیں گی۔ یہ نیم جاں لیٹا ہوا باپ اور یہ سہمی ہوئی لڑکی جانتے ہیں کہ اس کے گھر کے ایک اہم فرد کے سینہ میں بھالا پیوست کرنے کا پلان بنانے والے شہر کی چکنی چکنی سڑکوں پر چلتے ہیں۔ پھر بھی یہ اُن کا ظرف ہے کہ اندھیری رات میں شہر کے ایک اجنبی کو آواز دے کر وہ گھر میں بلا لیتے ہیں اور اپنے حصے کا کھانا اُس کے آگے رکھ دیتے ہیں۔

میں اپنا زخمی دل لئے لوٹ آیا ہوں۔ کاغذ کے اوراق میرے ٹیبل پر بکھرے پڑے ہیں، قلم میرے ہاتھ میں ٹھہرا ہوا ہے اور ذہن میں وہ سارا منظر ہے۔

کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے

جب تک میں ایک کہانی مکمل کر رہا ہوں گا کوئی دوسرا گاؤں جل اُٹھے گا..... کسی شہر کا کوئی محلّہ ویران ہو جائے گا۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ، آگ اور خون، چیخ اور پکار، خوف اور دہشت کے قدم بڑھتے چلے جاتے ہیں اور اخباروں میں محض رپورٹ، محض مذمّت اور بس!

●●

احمد صغیر کے دلت افسانے
ناقدین کی نگاہ میں

طبقاتی رشتوں کا نیا انداز بیانیہ

پروفیسر افصح ظفر

اُردو فکشن میں ادھر بیس پچیس سال سے ایک نام ابھر کر سامنے آیا ہے جس میں جدیدیت کے غلغلے سے ہٹ کر اُردو کہانی میں ایک ایسی فضا تیار کی ہے جس کو ہم نئی ترقی پسندی کے نئے رویے سے جوڑ کر دیکھ سکتے ہیں۔ کہانی کا ہر فنکار بنیادی طریقے پر یہ سوچ کر کام کرتا ہے کہ وہ اپنی کہانی میں جدید سے جدید تر بھی ہے اور ترقی پسند سے بھی زیادہ ترقی پسند یعنی اپنی دہی کو کون کھٹا کہتا ہے۔ لیکن نئی دنیا میں شعروادب میں بھی اور انسانی زندگی کے دوسرے شعبے میں بھی سکہ رائج الوقت کے طور پر فکشن کے افہام و تفہیم ہوتے رہتے ہیں۔ اس لئے جب احمد صغیر نے فکشن کی دنیا میں غالباً 1980 کے بعد جو رویہ اپنایا تو وہ ہماری سماجی اور سیاسی زندگی میں ایک نکسل وادی انداز پیدا ہو گیا تھا۔ اور احمد صغیر کو بھی لوگوں نے اس دائرے میں ڈالنے کی کوشش اس طرح شروع کی کہ ان کا کردار جوان کی کہانی انّا کو آنے دو میں ابھرا تھا۔ اسے اس طرح جوڑا گیا کہ اس نے کہانی کا کردار انّا کو روبینسن کروسو بنا دیا یا احمد صغیر کو نکسل واد کے اصلی تصور سے منسلک کر دیا۔ میں نے جب اس کہانی کو پڑھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ انّا کا کردار نہ تو روبینسن کروسو ہے جو امیروں کو لوٹ کر غریبوں کے گھر سجاتا ہے اور نہ انّا کوئی ایسی ذات ہے جو اپنے سماج کو چشم زدن میں بدل دے۔ صرف یہ کہنے سے ''انّا کو آنے دو سالو پتہ چل جائے گا۔'' اس کہانی کی پھلمتیا کی یہ آواز محض بھرم ہے ورنہ اس کہانی کے کردار کچھ اور سوچتے ہیں۔

''کیا اکیلا کوئی انّا اس نظام کو بدل دے گا یا ہر گھر میں ایک انّا کا وجود لازمی ہے۔ ہر گاؤں اور ہر قصبے اور ہر گھر میں انّا کی ضرورت

ہے جو موجودہ نظام کو بدلنے میں معاون ہو سکے۔لیکن اس قدر اناّ آئے گا کہاں سے۔ برسوں میں صرف ایک اناّ پیدا ہوتا ہے۔

بس ایک دن میں اسے ختم کر دیا جاتا ہے یا جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا جاتا ہے تو کیا ہر ماں کو ایک انا..........؟''

پھلمتیا یہ سب سوچ رہی تھی۔

اس عبارت کو پڑھنے کے بعد مجھے ایسا لگتا ہے کہ لوگ کچھ بنیادی سوال کو پیچھے ڈال دیتے ہیں اوران باتوں پر زیادہ زور دیتے ہیں جو ان کے ذہنوں میں، ان کے اپنے تصورات اور خیالات کے تحت ٹھپہ بن کر چکے ہوتے ہیں اور اپنے ذہن کی زنبیل میں ڈال کر سیاست میں بھی استعمال کرتے ہیں۔سماج میں بھی استعمال کرتے ہیں اورشعروادب میں بھی۔آپ ہمیں بتائیے کہ انسانی سماج کا کوئی ایسا گروہ' فرد یا قوم ہے جو انسانیت کی فلاح و بہبود کی خاطر کچھ نہیں سوچتا ہے۔کوئی مذہب' کوئی فلسفہ' کوئی مسلک ایسا نہیں ہے جس نے انسانیت کے خلاف کوئی فلسفہ' کوئی نظام پیدا کیا ہے۔وہ سارے لوگ چاہے وہ فطرت پسند ہوں یا فطرت پرست' چاہے وہ انسانی ارتقا کی خاطر فطرت سے نبرد آزما ہوں۔ان میں کوئی ایسا ہے جو انسانی اقدار سے انحراف' اختلاف یا انکار کرتا ہے۔اگر ایسا نہیں ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ جھونپڑیوں کی کہانی اس کے کردار اپنے سارے احساسات کے ساتھ ادب وشعر میں کیوں نہیں داخل ہو سکتے۔دنیا کا کوئی موضوع' کوئی نکتہ' کوئی جذبہ ادب کے فنکار کو چھیڑ سکتا ہے' اکسا سکتا ہے۔اسے اپنی طرف بلا سکتا ہے۔احمد صغیر ایک ایسا ہی کہانی کار ہے جو نچلے طبقے کے ان انسانوں پر قلم اٹھاتا ہے جو زندگی جینے کے لئے' وہی جذبات' وہی خیالات اور وہی افکار رکھتے ہیں۔جنہیں ہمارا سماج' ہمارا معاشرہ اور ہماری تاریخ حاشئے پر رکھتی ہے اور اس سماجی طریقے پر جنہیں ارذال کہا جاتا ہے۔ایسی ہی ایک کہانی پر احمد صغیر نے قلم اٹھایا ہے اور بنیادی تین کرداروں پر اس کے تانے بانے بنے گئے ہیں۔اس کہانی کا نام ہے''پناہ گاہ''۔لکھمنیا بنیادی کردار ہے جو اپنے شوہر اور بچی کے ساتھ ایک سڑک کے کنارے جھونپڑی بنا کر رہتی ہے اور شوہر اس جھونپڑی کے ایک حصے میں چائے کی دکان کھولتا ہے اور جیسے تیسے اپنی زندگی گزارتا ہے۔ان دو کرداروں کے رہن سہن اور طور طریقے سے پڑھنے والے کو ایک اندازہ ایسا ضرور ہوتا ہے کہ یہ کردار حاشیے کے ایسے کنارے پر زندگی کی لڑائی لڑتا ہے جس کے انداز و ادا سے یہ ضرور پتہ چل جاتا ہے کہ یہ کہیں نہ کہیں سے کسی نہ کسی طرح متوسط طبقے کی نمائندگی کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنا رویہ اس طرح پیش کرتا ہے کہ ہم اس کی اشرافیائی خواہش کے قائل ہو جاتے ہیں کہ بیوی محدود سی جھونپڑی میں رہنے کے باوجود سماجی طور پر اس طرح اپنے کو اور اپنی بچی کو سمیٹ کر رکھتی ہے کہ چائے پینے والے لوگ بھی اس کو دیکھ نہ سکیں۔یہ تصور لکھمنیا میں اتنے بھرپور طریقے سے بیدار ہے کہ جب اس کا شوہر مر جاتا ہے تو اپنی اور اپنی جوان ہوتی ہوئی بچی کو کسی نہ کسی طرح بچانے کی کوشش کرتی ہے اور چائے کی دکان سے کسی نہ کسی طرح کام چلا لیتی ہے مگر شوہر کے نہ ہونے کی وجہ سے اس کی بچی پڑھنے لکھنے سے وہ فائدہ نہیں اٹھا سکتی ہے جو اس قسم کے لوگوں کے لئے ضروری ہوتا ہے۔اسی لئے وہ اپنے ایک گاہک کو جو شریف ہے اور اسکول میں پڑھاتا ہے۔اس سے پڑھنے لکھنے کے سلسلے میں مدد لینا چاہتی ہے اور وہ ماسٹر جس کی سماج میں عزت ہے اس کی مدد کے لئے تیار ہو جاتا ہے اور اس کی بیٹی اور خود اس کی ماں دونوں بے حد ایماندارانہ سماجی رکھ رکھاؤ کے ساتھ رشتہ قائم کرتے ہیں اور ماسٹر جو اسکول میں پڑھانے کے علاوہ گھر میں بھی پڑھاتا ہے وہ اس کی بیٹی کو بھی پڑھاتا ہے اور اس کی آمد و رفت ماسٹر کے گھر کا معمول بن جاتا ہے لیکن جب وہ اس

معمول کی خلاف ورزی کو دیکھتی ہے تو وہ خود ماسٹر کے گھر جاتی اور دیکھتی ہے کہ جس محنت سے جس توقع کے ساتھ اور جن خواہشات کے ساتھ اس نے اچھے خواب دیکھنے شروع کئے تھے وہ سب ماسٹر اور اس کی بیٹی کے رشتے سے ٹوٹ اور بکھر کر رہ جاتے ہیں۔

میں نے اس کہانی کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ یہاں احمد صغیر فن اس کی فکر اور اس کا تخلیقی جذبہ جس طرح کہانی کی بنت میں شامل رہا ہے۔اس سے تو وہ اس الزام سے بری ہو جاتا ہے کہ یہاں احمد صغیر بنیادی طور پر ایک کہانی کار ہے اور اس کا نقطۂ نظر بس اتنا لگاؤ رکھتا ہے کہ اس کی کہانی فنی لحاظ سے تخلیق پذیر ہو۔

احمد صغیر کی ایک کہانی ''ہوا شکار'' ایسی کہانی ہے جو سیکس ورکر کے گرد گھومتی ہے اور کہانی کار نے اس میں کچھ نئے زاویے نکالنے کی کوشش کی ہے۔کہانیوں میں عام طور پر یہ موضوع بڑا اپٹا ہوا موضوع ہے۔ان گنت افسانے اور ناول اس پر اُردو میں ملتے ہیں اور دوسری زبانوں میں بھی۔سماجی زندگی میں اس موضوع کو نئی دنیا نے اقتصادی طور پر دیکھنا شروع کر دیا۔ یہ پیشہ عام طور پر تفریح اور عیاشی نا آسودگی کا نتیجہ ہوتا ہے۔اس کہانی میں سیکس ورکر کو استعمال کرنے والا کردار کچھ آدرش وادی سا ہے۔ وہ پتہ نہیں کس دھن میں رات بھر کے لئے ایسے ہی کسی سیکس ورکر کو خرید لیتا ہے اور عام رویے سے ہٹ کر دونوں فاعل ومفعول کہیں نہ کہیں سے آدرش کا شکار ہوتے ہیں۔ جہاں فاعل اپنے افعال میں نارمل نہیں رہتا۔وہاں مفعول بھی اپنے آدرش میں ایک مکمل ذات ہے اور دونوں اپنے اصول پر گامزن نظر آتے ہیں۔اور دونوں خرید و فروخت میں جس ایمانداری کا ثبوت دیتے ہیں اور یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے معاملات میں کتنے کامیاب ہیں۔ اس کہانی کو اگر ڈوب کر دیکھا جائے تو اس کے آخری مکالمے متن کی تفہیم میں وسعت پیدا کر دیتے ہیں اور یہی اس کہانی کی کشش ہے۔

''ہوا، خوشبو اور روشنی قید نہیں کی جا سکتی مسٹر............''

یہ کہہ کر وہ دروازے سے باہر نکل گئی اور میں ٹک ٹک اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔''

اسی قسم کی ایک کہانی ''شدھی کرن'' ہے ہماری سماجی زندگی میں جس طرح امیری اور غریبی کہانی کاروں کے لئے مقبول موضوع ہیں۔ اسی طرح ذات پات کی تقسیم بھی کہانی کا اہم موضوع رہا ہے۔ذات پات ہماری تاریخ کا بڑا پرانا قصہ ہے۔اب تک دنیاوی طریقے پر اس میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔نسل پرستی سے پیدا ہونے والی ذات برادری ہماری سائکی میں گھر کر چکی ہے۔انسان طرح طرح کے فلسفے، اس قسم کی اخلاقی اصول بنا بنا کر تھک ہار چکا ہے لیکن یہ تصور ابھی بھی ہماری سماجی زندگی میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ چھوٹی ذات اور بڑی ذات کا فاصلہ ابھی بھی پاٹا نہیں جا رہا ہے اگرچہ قومی اور بین الاقوامی طور پر اس سے نجات پانے کے لئے چھوٹی بڑی کوششیں ہوتی رہتی ہیں اور اسے ختم کرنے کے لئے جہاں تہاں اصول اور قائدے بنائے گئے ہیں اور ان ہی اصولوں کے تحت چھوٹی ذات کے کرشنا چودھری کی زندگی میں سماجی اور معاشی طریقے پر کچھ خوشگوار تبدیلیاں ہوتی ہیں اور وہ اسی طرح زمین پر رینگتے رینگتے اس طرح کھڑا ہوتا ہے کہ آخرش اس کا بیٹا بھی اتنا طاقتور بن جاتا ہے کہ گاؤں کا مکھیا ہریندر سنگھ آخرش اس کے بیٹے کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اپنے گھر بلا کر اسے سر آنکھوں پر بٹھاتا ہے۔ کیونکہ کرشنا چودھری کا بیٹا بڑا آفیسر ہو گیا ہے۔اور مکھیا اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے عزت واحترام کا مکھوٹا ڈال کر اپنا کام نکالنا چاہتا ہے لیکن کام ہونے کے بعد وہ اپنے اندر اس سائکی کا شکار ہوتا ہے جس وجہ سے یہ نظام ہماری سماجی زندگی کا ابھی بھی ایک

ڈھونگ بن گیا ہے۔ اس کہانی میں ایک اندرونی لہر یہ ہے کہ اصول وقوانین بنانے سے ہر جگہ کامیابی نہیں ملتی۔ اصل یہ ہے کہ انسانی رشتے کا احترام ہونا چاہئے۔ رنگ ونسل کے نظام کو سرے سے ختم ہونا چاہئے کیونکہ سماجی زندگی کا احترام پیوندکاری سے نہیں، قلمکاری سے ہونا چاہئے۔

احمد صغیر کی ایک کہانی ''تعفن'' مطالعہ کے لحاظ سے ایک اہم کہانی ہے۔ اس میں ایک امیر عورت ایک غریب بچے کی ایسی کہانی ہے جو انسانی فطرت کے لحاظ سے ہمارے معاشرے میں رونما ہوتی رہتی ہے۔ یہ امیر عورت ایک ایسی ماں ہے جس کی گود خالی رہتی ہے اور وہ کسی ہر ایرے غیرے بچے کو دیکھ کر ایسی اُنسیت محسوس کرتی ہے کہ جس کی وجہ سے امیر وغریب کا سماجی فاصلہ کم سے کم تر ہوتا جاتا ہے۔ اور منوا اپنی کمسن عمر کے باوجود جینے کے لئے بدبودار کچرے میں زندگی تلاش کرتا رہتا ہے اور منوا کی ماں بیٹے کا انتظار اس لئے کرتی ہے کہ اس کا بیٹا سامان حیات لانے والا ہے۔ دوسری طرف وہ امیر عورت منوا کو للچائی نظر سے دیکھتی ہے۔ کیونکہ وہ ماں نہیں بن سکتی۔ دوسری طرف اس کی ماں اپنے بیٹے کا انتظار اس لئے کرتی ہے کہ پیٹ کا مسئلہ اس کا بیٹا حل کرنے والا ہے۔ یہاں پر معاشرتی اور نفسیاتی طریقے پر کچھ سوالات کھڑے ہوتے ہیں اور وہ سوالات یہ ہیں کہ ان دونوں عورتوں کی ضرورتوں کے پس منظر میں جو جذبہ کام کر رہا ہے۔ وہ ہمارے سماج کا ایسا نمونہ پیش کرتا ہے کہ جس کے ذریعہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا سماج کہیں نہ کہیں سے غیر سائنٹفک انداز سے پھلنے پھولنے کی کوشش کر رہا ہے اور ہمارے طرز حیات میں انفرادیت اور اجتماعیت کا غیر متوازی نظام اتنی دور تک چلا گیا ہے کہ غربت تقدیر کا کھیل بن گیا ہے اور فطرت انفرادی اور اجتماعی طریقے پر انسانیت نواز نہیں بن پائی ہے۔ ایک ماں کو فطری طریقے پر پیٹ کی آگ کو بجھانے کی ضرورت پڑتی ہے اور دوسری عورت کو فطری بھوک کو مٹانے کے لئے طرح طرح کے رویے اختیار کرنے پڑتے ہیں اور اس کے نتیجے میں تینوں کردار یعنی منوا' اس کی ماں اور امیر عورت آخرش شکست کھا جاتی ہے کہ فطرت نابرابری کے غیر انسانی چلے آرہے صدیوں کے سماجی نظام کے ذریعے ایک ایسی فطرت پیدا کردیتی ہے جو غربت کی تہہ میں پہنچ کر فطرت ثانیہ بن جاتی ہے اور دونوں ماؤں کا چہیتا منوا بے ہوش ہوجاتا ہے۔ میرے خیال سے کہانی کار نے کہانی کا اختتام اسی لئے ایسا رکھا ہے۔

نئی دنیا کے افکار وخیالات اور احساسات نے اتنی تیزی سے تبدیلیاں ہورہی ہیں کہ ہم بھی گمان کو یقین اور یقین کو گمان بنا دیتے ہیں۔ کبھی ماضی کو آئندہ میں لے جاتے ہیں اور کبھی اس کے برعکس قدم اٹھاتے ہیں۔ یہاں تک کہ گزرے کل اور آنے والے کل میں فرق کا رشتہ کمزور ہوجاتا ہے۔ یہی حال فکشن کے پس منظر میں بیانیہ کا ہے جہاں الٹ پھیر چلتا رہتا ہے۔ انگریزوں کی آمد کے بعد فکشن کی جو لکیر کھینچی گئی تھی کہ جس کی ابتداء مشرق میں کلکتہ سے ہوئی تھی اور دوسرے کا ضدی سلسلہ لکھنؤ سے شروع ہوا تھا۔ میرا اشعارہ ہے میر امن کے ''باغ و بہار'' سے ایک طرف اور دوسری طرف رجب علی بیگ سرور کے ''فسانۂ عجائب'' سے ہے۔ میر امن بیانیہ کے طرز کو جس طرح سائنٹیفک بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اس کے خلاف سرور ضد پر اڑے رہ کر اشرافیہ کی اس زبان کو سامنے لاتے ہیں جس میں رنگ تو تھا لیکن نثر کا آہستہ رو آہنگ غائب تھا۔ سرور کی نثر میں ملمع سازی تھی اور امن کی نثر میں روانی۔ سرور کی نثر میں جھنکار یورش تھی اور امن کی نثر میں بانسری کا سریلا پن۔ یہ سریلا پن آگے بڑھ کر ہمارے سامنے نصوح کا خواب بن کر ابھرتا ہے اور ''ابن الوقت'' میں ایک خاص حکایتی انداز سے بے حد خوشگوار تیکھے پن کو پیش کرتا ہے اور آگے چل کر شرر کی ''فردوس بریں'' میں حکایتی انداز کا نمونہ سامنے لاتا ہے۔

دوسری طرف سرور کا اثر نیاز فتح پوری کے خیالستان اور جمالستان میں ظہور پذیر ہوتا ہے اور پھر اسی عہد کے فنکاروں نے گوتھیک طرز کی حیرتنا کی، تعجب خیزی اور سرّ ی اور نفسیاتی اور مافوق الفطری تھرتھراہٹ کو پیش کرتا ہے۔ اور یہ طرز وقتی ہوتا ہے اور جادو کی طرح ہمیں متاثر کر جاتا ہے لیکن لذت فن کی زندگی چند ثانیہ سے زیادہ نہیں رہتا اور جب میرامن کے طرز کا دائرہ وسیع ہوتا ہے تو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔ یہ سلسلہ اسی لئے آج بھی جاری ہے۔ چاہے آپ اسے کوئی نام دے دیں۔ احمد صغیر اسی راستے پر رواں دواں ہیں۔

آخر میں میں یہ بھی عرض کر دوں کہ مختصر افسانہ بننے کے عمل میں وہ اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ کہانی کی ترسیل تبلیغی بھی نہ رہے اور نہ ہی ان کی زبان ترسیل کا المیہ بن جائے۔ کیونکہ اردو والے ادبی دنیا میں کس طرح جیتے ہیں ان کے بارے میں میں زیادہ نہیں جانتا لیکن ہندوستان اور پاکستان میں ایسا ضرور ہے کہ اُردو والے زیادہ تر گراؤنڈ لیول پر جی رہے ہیں۔ ایسے میں آپ سالانہ ادبی جشن منا کر زمینی حقیقت سے گریز کریں گے۔ آج جس طرح بیانیہ کی اصطلاح کا کہانی کی دنیا میں استعمال ہو رہا ہے۔ اس کا تعلق ان لوگوں سے بالکل نہیں رہا ہے جو ہزاروں اور لاکھوں سے بڑھ کر کروڑوں کی تعداد سے منسلک ہیں لہٰذا بیانیہ کی تعریف اور توصیف کرنے سے پہلے یہ ضرور سوچنا چاہئے کہ بیانیہ داروغہ کی رپورٹ بھی ہے۔ میرامن کی تحریر بھی اور رجب علی بیگ کی رنگ برنگی تحریر بھی۔ بیانیہ کوئی اجنبی تشبیہہ نہیں۔ بیانیہ اردو غزل کا کوئی مصرعہ نہیں۔ بیانیہ کہانی کے دائرے میں ایک مسلسل عمل ہے جو کسی تجربے، مشاہدے کے اثر و رسوخ سے ایک ایسی نثر کی نمونہ سازی کرتا ہے جو آر پار سے گزر کر ہمیں احساسات کی دنیا میں لے جاتا ہے۔ بیانیہ تقطیع اور تشریح سے بھی آگے کی شئے ہے اور یہ شئے جب کہانی کار کے قلم سے پوری پختگی کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے تو اس کا اثر دور رس ہوتا ہے کہ کہانی کار کی کہانی ہمیں اس وقت اچھی معلوم ہوتی ہے جب وہ واعظ کی نصیحت کو اس طرح اپنی تخلیقی ژولیدگی میں الجھاتا ہے کہ ہم معنی کی تلاش میں دور دور چلے جاتے ہیں۔ ہم اردو والوں کی کہانیاں وہیں پھلتی پھولتی ہیں جہاں زندگی کی جھلک دیکھتے ہیں اور کہانی کی یہ جھلک بند کمرے میں خوبصورت قلم سے نہیں لکھی جاتی اور اگر لکھی جاتی ہے تو وہ سرد خانے کا حصہ بن جاتی ہے۔ میں نے احمد صغیر کی بیسیوں کہانی میں سے جن چند کہانیوں کا تجزیہ کیا ہے۔ وہ اسی نقطہ نظر سے ہے۔

●●

انحراف اور احتجاج کے افسانے

پروفیسر علی احمد فاطمی

زندگی کے پیچ و خم اور کیف و کم کو سمجھانے یا سمجھنے کی کوشش کرنا یا اس کی اصل حقیقت و ماہیئت تک کی رسائی کا عمل ایک تجسس و تلاش کا عمل ہے اور تجسس و تجزیے سے پُر تلاش حقیقت کا عمل دراصل ایک جمالیاتی عمل ہے جس میں عرفان و شعور، ادراک و آگہی کے ایسے عناصر کام کرتے رہتے ہیں جو باطنی اور خارجی مظاہر میں مُدغم ہو کر علم و فکر، خیال اور جمال کی ایک نئی دنیا آباد کرتے ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ

تلاشِ حقیقت خود ایک عمران و جمالیاتی عمل ہے۔ یہاں میں یہ عرض بھی کرتا چلوں کہ جمال یا احساسِ جمال کو میں محض داخلی تجربہ یا باطنی احساس نہیں مانتا۔ داخلیت ایک نقطۂ آغاز تو ہوسکتی ہے لیکن خارجی مظاہر اور سماجی آزار و آثار کے بغیر اس کی تکمیل و تشکیل ممکن نہیں۔ سماجی آزار و آثار کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ خارجی بھی اور داخلی بھی۔ یہ الفاظ دیگر حقیقتوں کے ایک روپ ہوا کرتے ہیں جن میں ایک حقیقت دلت کا بھی ہے۔ یوں تو دلت اور غیر دلت کے مسائل ہمیشہ سے رہے ہیں لیکن ان کے کچھ دائرے تھے اور زاویے بھی۔ ان دائروں کو غیر دائروی انداز سے سمجھا بھی گیا اور خوب خوب لکھا گیا لیکن اب جب کہ دلت سماج کا کچھ حصہ پڑھ لکھ چکا ہے اور ادب کی تشکیل و تخلیق میں بے باکانہ طور پر مصروف ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اصلی اور سچا دلت ادب وہی ہے جو دلت ادیب خلق کرے اور اپنے خون جگر سے رقم کرے۔ جس نے اس درد و کرب کو براہ راست برداشت کیا ہے۔ غیر دلت ادیب درد و کرب کی اس تڑپ اور حقیقت کو سمجھ ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ دور کا تماشائی ہے اور اس کی ہمدردی خارجی اور ظاہری ہے۔ بظاہر یہ بات منطقی سی لگتی ہے لیکن ادب کی تخلیق کے لیے غیر منطقی سی بھی لگتی ہے۔ اس لیے کہ تخلیقِ ادب کے لیے آج تک سائنس اور تکنیکی فارمولے ایجاد نہیں ہوئے ہیں۔ وہ کبھی بلکہ اکثر غیر سائنسی اور غیر منطقی ماحول میں پیدا ہوتا ہے۔ ناہموار و ناموافق ماحول میں بڑے تخلیق ہو جایا کرتی ہے۔ 1807 کا انقلاب ہو یا 1947 کی تقسیم و فسادات۔ اس انتشاری و بحرانی ماحول میں جو ادب خلق ہوا اس کی تاریخی حیثیت و عظمت سے کون انکار کر سکتا ہے۔

دلت مسائل سے متعلق دلت ادب کو لے کر بھی یہی بات کہی جا سکتی ہے۔ اصل دلت وہی ہے جو صرف دلت لکھے دوسرے ادیب دلت مسائل پر نہ لکھیں اور لکھیں تو وہ غیر حقیقی ہوں گے۔ یہ بات ناقابل قبول سی لگتی ہے ——— اس حقیقت سے انکار نہیں کہ ماحول و سماجی قوتیں تبدیلی کے ساتھ نئے انسانی رشتوں اور نئی قدروں کی نشاندہی کرتے ہیں اور نئے سماجی شعور سے ذہنی غذا حاصل کرتے ہیں کہ اس شعور اور وژن کے بغیر تخلیق تھوڑی دیر کے لیے خوبصورت تو ہوسکتی ہے لیکن بڑی نہیں۔ بڑا ہونے کے لیے اسے پریم چند کی راہ سے گذرنا ہوگا بلکہ پریم چند بننا ہوگا۔ تھوڑی دیر کے لیے دلت ادیبوں و دانشوروں کی اس منطق کو مان بھی لیا جائے اور تخلیق کی غیر منطقی شرط کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو سوال اُٹھ سکتا ہے کہ دلت ادب میں اب تک پریم چند کے قد کا ادیب کیوں نہیں پیدا ہوسکا۔ اچھے اور بڑے ادب کے لیے صرف درد و کرب کا فن نہیں صرف سوزِ دروں بھی کافی نہیں۔ ذہن اور وژن بھی درکار ہوتے ہیں۔ اس کی سب سے اچھی مثال میر اور غالب کے مابین کی ہے۔ میر تقی میر کے سوزِ دروں سے ایک مخصوص سوز و گداز ضرور پیدا ہوا اور جس کے بطن سے عمدہ شاعری بھی ہوئی لیکن وہ غالبؔ کی طرح عظیم نہ بن سکے۔ اس لیے کہ حیات و کائنات کے تئیں ان کا سماجی و رمعروضی وژن غالب کے مقابلے کمزور تھا۔ آخر کوئی تو بات ہے کہ جب پریم چند نے لکھنا شروع کیا رورومانی افسانہ نگاروں کی ایک جماعت ان کی مخالفت اور قدیم رومانی روایت کے تحفظ میں صف آراء ہوئی لیکن پریم چند کی سی شہرت و عظمت کسی کو حاصل نہ ہوسکی۔ قصہ مختصر یہ کہ ادب کے معاملات سماجیات اور سیاسیات کے شعبوں سے قدرے الگ ہوا کرتے ہیں اور اس کا کوئی ٹھوس فارمولہ یا پہاڑا نہیں ہوا کرتا۔

یہ بظاہر غیر ضروری اور غیر منطقی سی گفتگو میں نے اس لیے کی ہے کہ پیش نظر مسودہ میرے عزیز دوست اور ممتاز ترقی پسند افسانہ نگار و ناول نگار احمد صغیر کا دلت افسانوں سے متعلق ہے اور اردو میں باقاعدہ دلت کہانیوں کے دو ایک انتخابات تو ہوئے ہیں لیکن کوئی مکمل

کتاب جو محض دلت افسانوں سے متعلق ہو میری نظر سے نہیں گزری۔ اس لیے بطور تمہید دلت ادیب و ادب سے متعلق یہ سرسری گفتگو ضروری سی تھی۔ اب میں براہ راست ان کی کہانیوں پر گفتگو کروں گا۔

اس مجموعہ کی پہلی کہانی ''تعفن'' ہے۔ عنوان سے ظاہر ہے۔ دلت اور تعفن۔ ساتھ ہی بوسیدہ اور گندی بوتلیں۔ ٹین کے ڈبے۔ شیشے کے ٹکڑے اور لالٹین کی مدھم روشنی۔ آدھا کچا اور آدھا پکا کھانا اور بورے پر سو جانا۔ دلت زندگی کے معنی خیز اشارے ہیں۔ ظاہر ہے کہ زندگی میں دکھ درد تو ہوگا خواہ منوا ہو یا دھنوا لیکن خواب تو بورے پر بھی دیکھے جا سکتے ہیں لیکن خواب اور حقیقت میں ایک بے رحم وسفاک رشتہ بھی ہوتا ہے کہ خواب دیکھنا ایک فطری عمل ہے اور خوابوں کا ٹوٹنا سماجی عمل اور دلت معاشرہ تو اور بھی بکھرا اور شکستہ لیکن اس کہانی میں پرانا دلت ایک نو آبادیاتی سماج سے بھی دو چار ہے۔ منوا پر مسز ملکانی کی مہربانی اور اٹھتا ہوا سوال ——— اس عورت سے کیا رشتہ ہے مرا؟ یہ عورت مجھ پر اس قدر مہربان کیوں ہے؟ یہ سوال بابہ تجسس کہانی کا اصل حال ہے۔ مرکزی خیال ہے اور دوسری طرف مسز ملکانی کی صورت حال۔ ممتا کا جال یا کچھ اور ——— کہانی کی ساخت اگر چہ سادہ سی ہے لیکن رفتہ رفتہ منوا کے کردار سے زیادہ اہم ہو جاتا ہے مسز ملکانی کا کردار جو تجسس، تحیر کے رنگ میں ابھرتا ہے اچھی بات یہ ہے کہ اسی تجسس پر کہانی ختم ہوتی ہے۔ ممتا اور محبت کا ایک انوکھا عکس ابھرتا ہے اور جو منوا کو مدہوش کر جاتا ہے۔ مصنف نے اس بے ہوشی کو بھی ایک معنی دیے ہیں کہ ایک دلت کردار کچرے میں جینے والا بچہ خوشبو کا عادی نہ تھا۔ اسے خوشبو میں گھٹن محسوس ہونے لگتی ہے۔ وہ سڑانڈ کی طرف بھاگنا چاہتا ہے۔ انسانی رشتوں میں بندھا ہوا طبقاتی تفریق کا یہ بلیغ اشارہ کہانی میں بڑے سلیقہ سے ابھرتا ہے اور اسے کئی جہات والعباد سے دو چار کرتا ہے۔ مختصر سی کہانی میں مختصر سا یہ تاثر روایتی کہانی سے الگ کر جاتا ہے۔

''انا کو آنے دو'' میں پھلمتیا ہے۔ کردار تو اور بھی ہیں لیکن فسادات میں مارے گئے بچی ہے صرف پھلمتیا۔ اکیلی۔ دلت بیداری کی مہم۔ انا کا کردار۔ کہانی فلیش بیک میں چلتی ہے۔ مزاحمت و احتجاج۔ آسمان کی سرخی۔ سرمئی اندھیرا۔ ان سب کے فنکارانہ آمیزشوں سے دلت سماج کی بے بسی و بیداری کے عکس ابھرتے ہیں لیکن انا امید کی کرن ہے لیکن اس کو بھی لمبے اور گہرے اندھیروں کا سامنا ہے اور سوال ''کیا اکیلا انا اس نظام کو بدل دے گا؟'' سوال اہم ہے لیکن کہانی کے بطن سے پھوٹتا تو تخلیقیت متاثر نہ ہوتی اور تاثیر میں کمی نہ آتی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ برہنہ مسائل اکثر راست گوئی پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ مسئلہ کہانی کار کا کم موضوع کا زیادہ ہوا کرتا ہے۔ پھلمتیا تمام مظالم سہتی رہی لیکن یہی کہتی رہی کہ ''انا کو آنے دو ——— آنا کو آنے دو ———'' انا ایک کردار نہیں ایک احتجاج ہے۔ انقلاب ہے جسے کہانی کار کی مثالیت کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔

''ڈوبتا ابھرتا ساحل'' میں سگنی ہے ایک کم عمر لڑکی جو اسکول جانے کے بجائے داتون بیچتی ہے۔ غریب اور کمزور سگنی جس کی زبان بند رہتی ہے اور آنسو بولتے رہتے ہیں لیکن انہیں آنسوؤں نے اسے سخت جان بھی بنایا تھا کہ آنسو زندگی کی بیڑی نہ بننے پائیں۔ زندگی میں زنجیروں کا بھی الگ رول ہے۔ یہ جملے دیکھئے:

''وقت کی زنجیروں میں ہر شخص گرفتار ہے۔ کوئی زنجیر توڑ کر نکل جاتا ہے۔ کوئی زندگی بھر اسی میں گرفتار رہتا ہے۔ کوئی زنجیر خود

پہن لیتا ہے اور کسی کو وقت پہنا دیتا ہے۔ وقت ہر لمحہ ایک زنجیر جوڑتا رہتا ہے۔ ایک سرا کبھی دوسرے سے نہیں ملتا۔ حالانکہ اس سرے کا پتہ لگاتے لگاتے انسان موت کی زنجیر اپنے گلے میں ڈال لیتا ہے۔''

جھونپڑی میں آگ۔ ماں باپ کی موت اور پھر یہ جملے:

''دکھ کا کوئی نام نہیں ہوتا دکھ تو بس دکھ ہے۔ دل سے آنکھوں تک ہی دکھ ہے۔ دکھ کی وجہ سے ہی آنکھیں ساون بھادو بن جاتی ہیں۔ دل رونے لگتا ہے مگر دکھ نہیں پگھلتا۔

لیکن بے رحم سے بے رحم انسان کبھی کبھی پگھل بھی جاتا ہے۔ جیسے اس کہانی میں بے رحم سپاہی پگھلتا ہے اور وہ سگنی سے سنگیتا بن جاتی ہے۔ اسے ایک نام مل جاتا ہے۔ لیکن انسان کا کام آسانی سے نہیں مرتا لیکن کہانی کا کلائمکس کہانی کو بے حد اہم اور معنی خیز بنا دیتا ہے اور جگا 'بابو گوپی ناتھ جیسی بڑی کہانیوں کی یاد دلا جاتا ہے۔

''پیاسی ہے زمیں پیاسا آسماں'' میں منکی ہے جس کا تعارف یہ ہے:

''منکی کے وقت کا سورج بوڑھا ہو چلا تھا۔ وہ وقت کے سورج کی تیز دھوپ میں برسوں سے تپ رہی تھی۔''

منکی کا بچہ دودھ سے تڑپتا رہتا ہے اور عقیدت مندان گنیش جی کی مورتی کو دودھ سے نہلاتے رہے۔ زندگی کا' اعتقاد کا ایک معنی خیز تضاد۔ ایک انوکھا رنگ۔

''فصیل شب میں جاگتا ہے کوئی'' میں کارو مانجھی ہے۔ فضا میں اداسی ہے لیکن اس اداس و تاریک ماحول میں یہ تخلیقی جملہ ملاحظہ کیجئے ——— ''لالٹین کی مدھم روشنی صحن میں اس طرح پھیل گئی جیسے بھوکے آدمی کے پیٹ میں روٹی کے چند نوالے چلے گئے ہوں ———'' لیکن کہانی مزاحمت واحتجاج کے نئے راستوں پر چلی جاتی ہے۔

''پناہ گاہ'' میں لکھمنیا ہے جہاں یہ جملہ ہے ——— ''ہمرا مقدر ہی خراب ہے بیٹی۔ ہم بدنصیب ہیں۔ اور یہ سوال بھی ——— '' سارے دکھ ہم غریبوں کے ہی قسمت میں کیوں لکھ دیا گیا ہے؟''

سوالات اور بھی ہیں خیالات بھی اور کہیں کہیں جوابات بھی۔ جوابات کی شکل آج کی بدلتی ہوئی صورت حال ہے۔ دلتوں کا جلال ہے جواب کئی شکلوں میں دکھائی دیتا ہے۔

کہانیاں اور بھی ہیں مسائل کے ارد گرد ——— سادہ لیکن بامقصد اور پر اثر دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کی اثر انگیزی اس کی روایت پرستی میں ہے۔ کوئی چاہے تو اعتراض کر سکتا ہے کہ اب دلتوں کے بھی وہ مسائل نہیں رہے جو آج سے سو پچاس برس قبل تھے۔ یہ سچ ہو سکتا ہے لیکن ہندوستان جیسے ملک میں جہاں آج بھی اندھیرا ہے' اندھ وشواس ہے اور جبر و جہل کا کھیل ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اب اس کھیل کی نوعیت بدل گئی ہے۔ طریقۂ استحصال بھی بدل گیا ہے لیکن انسان اور انسان کے درمیان تفریق اور تعصب کا کھیل آج بھی جاری وساری ہے۔ اس لیے کہ طاقت اور ناطاقت کا کھیل ہمیشہ چلتا رہتا ہے۔ اچھی بات یہی ہے کہ مصنف نے بعض کہانیوں کو دلت مسائل کے ساتھ ساتھ نکسلائٹ کے مسائل سے بھی جوڑ دیا ہے۔ بلکہ بعض کہانیوں یں نکسلائٹ کا ہی مسئلہ ابھرتا ہے۔ دلت غائب ہو جاتا ہے۔ مثلاً ''بے

پناہ جنگل اور وجود' اس کہانی میں مسلم کردار ہیں۔ مولوی لیاقت علی۔ آمنہ اور علی عباس۔ رات کا اندھیرا اور نکسلائٹ کا گھیرا لیکن ساتھ میں یہ جملہ بھی ہے ——— ''سوچ کی روشنی بلند ہوتی ہے اور دور دور تک ایک لمبی لکیر بناتی ہوئی گزر جاتی ہے اور کہانی اس کشمکش پر ختم ہوتی ہے۔

''قانون کے وعدوں پر بوڑھا ہو جائے

یا

خود کوئی قانون بنائے۔''

کلائمکس میں سوال۔ سوال در سوال کہ یہیں سے فکر و خیال کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور سچ پوچھئے تو فکر و فلسفہ سے ہی کہانی اور افسانہ بنتی ہے۔ لارنس نے غلط نہیں کہا تھا کہ فکشن جب تک فلسفہ نہ بن جائے بڑا فکشن کہلائے جانے کے لائق نہیں ہوتا۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ہر واقعہ ضروری نہیں ہے کہ عمدہ کہانی بن جائے جب تک کہ کہانی کار کا اپنا ذہن اور وژن شاملِ فکر و فن نہ ہو۔ احمد صغیر ترقی پسند ادیب ہیں اس لیے حیات و معاشرہ کے تئیں ایک نظریہ رکھتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ ان کی کہانیوں میں یہ نظریہ و رویہّ خارجی سطح پر زیادہ دکھائی دیتا ہے جبکہ نظریہ کو تحلیل ہو کر فنکارانہ تجسیم میں جذب ہو جانا چاہئے۔ اس عمل میں ایک تخلیقی حقیقت یا افسانوی حقیقت بھی ابھرتی ہے جو حقیقت کو وجدان میں بدلتی چلتی ہے کہ خالص حقیقت نگاری سے افسانہ کی ترسیل و تفہیم آسان اور جلد ضرور ہو جاتی ہے لیکن تخلیق میں گہرائی اور تہہ داری مشکل سے پیدا ہو پاتی ہے۔ یہ افسانوی حقیقت بہ الفاظ دیگر درمان اور وجدان ہی اسے دور تک لے جاتا ہے۔ جہاں ایک طرف یہ ضروری نہیں کہ ہم ایک بہتر اور حسین زندگی کا خواب دیکھیں اور زندگی ویسی ہی میسر ہو جائے اسی طرح یہ بھی ضروری نہیں کہ زندگی اور حسن یعنی جمال کا کوئی ایسا میکانیکی رشتہ قائم ہو جائے کہ زندگی حسین تو ہو جائے اور اس سماج میں اس کا عکس بھی اتنا ہی حسین ہو' اس لیے زندگی کا عمل بھی میکانیکی نہیں ہوتا اور چونکہ ادب زندگی کا آئنہ اور عکس ہوتا ہے۔ اس لیے ادب میں بھی اس طرح کا میکانیکی عمل نہیں ہوا کرتے۔ ان سب کے باوجود ایک بہتر زندگی کا خواب دیکھنا ہر انسان کا فطری عمل ہے اور افسانہ نویسی فکری و تخلیقی عمل۔

احمد صغیر کی یہ کہانیاں حقیقت سے زیادہ قریب ہیں حالانکہ جا بجا رومانی و تخلیقی جملوں اور عنوانوں نے اسے بڑی حد تک افسانوی فضا بنائی ہے تاہم ان کی ترقی پسندی' سماجی وابستگی نے بڑے خلوص و اہتمام سے اسے جذب و پیوست کیا ہے۔ اس لئے کوئی چاہے تو اسے اکہری یا جامد حقیقت کہہ سکتا ہے جبکہ حقیقتیں سیال بھی ہوا کرتی ہیں اور پیچیدہ بھی۔ کہیں ماسٹر بد کردار ہو جاتا ہے اور کہیں بد دماغ مالکن پر ممتا غالب آجاتی ہے اور کہیں ظالم اور سخت پولس والا اچانک نرم اور رحم دل ہو جاتا ہے۔ کرداروں کے ان متضاد رویوں سے انسان کی بوالعجمی تو ظاہر ہوتی ہے۔ کہانی کا تاثر بھی دلچسپ اور معنی خیز ہو کر زندگی سے جڑ جاتا ہے۔ اس عمل کو پیش کرنے میں صغیر خاصے کامیاب ہیں۔ دلت اور غریب طبقہ سے وابستہ یہ کہانیاں فن اور تہذیب کے اعتبار سے جس معیار کی بھی سمجھی جائیں لیکن فنکار کی صداقت اور زندگی کی حقیقت سے الگ کر کے دیکھ پانا مشکل ضرور ہے۔ ان کہانیوں میں انسانیت بالائی سطح پر تیرتی نظر آتی ہے اور انسانیت سے بڑی کوئی شے نہیں' اس کا اپنا جمال ہوتا ہے اور جلال بھی۔ دلت پر لکھنا یوں بھی آسان نہیں۔ ایک اردو افسانہ نگار کے لیے ایک مسلمان کے لیے بطور خاص اس لیے خالص دلتوں اور غریبوں کے خشک و غیر دلچسپ مسائل پر افسانے لکھ کر احمد صغیر نے جرأت و جسارت کا کام تو کیا ہی ہے یہ افسانے

احتجاجی تو ہیں ہی انحرافی بھی ہیں۔ بہت پہلے پریم چند نے بھی انحراف کیا تھا تو ان کے خلاف احتجاج ہوا تھا۔ آج صورتِ حال بدل ضرور گئی ہے لیکن ہم اندر سے آج بھی فیوڈلزم سے زیادہ الگ نہیں ہیں اس لیے ان کہانیوں کی قبولیت میں رخنے آسکتے ہیں لیکن ان کی انحرافی وا حتجاجی کیفیت سے انکار نہیں کر سکتے کہ یہی کیفیت اور خاصیت ہی ان کہانیوں کو پڑھوائے گی اور اس کی انسانیت ہی اسے زندہ رکھے گی۔ اس جسارت کے لیے احمد صغیر یقیناً مبارک باد کے مستحق ہیں۔

●●

وهاب اشرفی:

''انا کو آنے دو'' میں احمد صغیر کی فنی للکار خاصے کی چیز ہے اور پسماندہ اور سب الٹرن کے لیے مرہم اور روشنی کا کام سرانجام دیتی ہے۔ (مابعد جدیت مغمرات وممکنات)

ڈاکٹر علیم الله حالی

اردو افسانہ نگاروں کی نئی کھیپ میں احمد صغیر کا ذکر ناگزیر ہے۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''مُنڈیر پر بیٹھا پرندہ'' شائع ہوا تو اس نے بہت سے ناقدین اور افسانہ نگاروں کو چونکا دیا۔ متعدد لوگوں نے اعتراف کیا کہ احمد صغیر اردو افسانے کو ایک نئی جہت عطا کرنے کے حامل ہیں۔ غنیمت یہ ہے کہ احمد صغیر نے ان اہم افراد کے اعترافات کا وہ تاثر حاصل نہیں کیا جس کے نتیجے میں فن کار اپنے آپ کو معیار کی اعلیٰ بلندی پر تصور کر کے مطمئن ہو جاتا ہے۔ سچا فن کار تعریف و تحسین سے یہ درس لیتا ہے کہ اسے اس راستے پر آگے بھی سفر کرنا چاہئے اسلئے کہ کامیابی کی آخری منزل کوئی نہیں ہوتی۔ یہاں بس سفر ہی سفر ہے۔ اچھے قاری یا ناقد کی رائیں فنکار کو مہمیز کرتی ہیں اور اسے آگے بڑھنے کے لئے اکساتی رہتی ہیں۔

چنانچہ احمد صغیر کو ان ہمت افزائیوں نے افسانہ نگاری کی آگے کی منزلیں طے کرنے کا حوصلہ دیا اور اس کے نتیجے میں 2001 میں ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''انا کو آنے دو'' شائع ہوا۔ اس کی آمد نے ان کی تخلیقی شخصیت میں اور اضافہ کیا۔ میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ اس مجموعے کے چند بہترین افسانوں نے ان کے لئے تخلیقی سمت کی راہ متعین کر دی ہے۔

احمد صغیر کے اس افسانوی مجموعے میں یوں تو ''سایہ''، ''روشنی بلاتی ہے''، ''سوچ کا کرب'' اور ''مریاد اور تانڈو رقص'' جیسی رسمی اوسط درجے کی کہانیاں بھی موجود ہیں۔ لیکن احمد صغیر کی اصل پہچان ان کہانیوں سے بنتی ہے جن میں احتجاج اور انقلاب کی چنگاریاں پھوٹتی ہیں۔ ابھی جن کہانیوں کا ذکر کیا گیا ہے ان سے فنکار کے سماجی، سیاسی اور عصری شعور کا اندازہ ضرور ہوتا ہے مثلاً ''مریاد اور تانڈو رقص'' میں اپنے ملک کے تہذیبی انتشار کی عکاسی ملتی ہے جہاں مذہب کے نام پر سیاست کرنے والے ملک کی سالمیت اور اتحاد و یکجہتی کو برباد کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ کہانی ''بھگوان کے نام پر'' بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ ''سوچ کا کرب'' خاندانی منصوبہ بندی کی حمایت کرتی ہے۔ اس میں

اس بیداری کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ جوئی نسل اپنے بزرگوں کے مقابلے میں زیادہ سنجیدگی کے ساتھ محسوس کرتی ہے۔ کہانی ''روشنی بلاتی ہے'' ایک عام روایتی کہانی ضرور ہے لیکن بے روزگاری کی صورت میں جذبات کی شکست کا منظر نامہ جس انداز میں پیش کیا گیا ہے اس سے عمومی موضوع میں خصوصیت پیدا ہوگئی ہے۔

ان کہانیوں سے صرف نظر کرتے ہوئے میں احمد صغیر کے ان فن پاروں کا ذکر بطور خاص کرنا چاہتا ہوں جو انہیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز بناتے ہیں اور کہیں کہیں تو ان کا قد اتنا بلند ہو جاتا ہے کہ وہ ماقبل نسلوں کی فنی بلندیوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ میں یہ دعویٰ خاص طور پر ان کی کہانیوں ''انا کو آنے دو''، ''پیاسی ہے زمیں پیاسا آسماں''، ''اووَر ٹائم'' ''جنگ جاری ہے'' اور ''کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی'' کی بنیاد پر پیش کر رہا ہوں۔ ان کہانیوں میں احتجاج کی تیز لے اور فن کی جمالیات کا آتنا حسین امتزاج ہے کہ شاید وباید Establishment — کے خلاف لکھنے والوں کی کمی نہیں۔ اکثر و بیشتر یہ ہوا ہے کہ ایسی کہانیاں کبھی تو موضوعات کی خارجی پیشکش پر غیر ضروری ارتکاز کی نذر ہوگئیں اور کبھی بعض افسانہ نگاروں نے ان میں علامت واشارت کے وہ گُر پیچ دکھانے شروع کئے کہ اصل موضوع اور جذبے کی تاثیر ہی ختم ہو گئی۔ میں احمد صغیر کے فن سے اس لحاظ سے خاص طور پر مطمئن ہوں کہ وہ ایک مشن اور Committment کے ساتھ کہانی کی جمالیات کا ایک خوبصورت آمیزہ تیار کر لیتے ہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ان کہانیوں کے پیش نظر احمد صغیر کے وہ نظریات اور ان کے آئیڈلس ہویدا ہوتے ہیں جن سے آج کے معاشرے کو بدلا جا سکتا ہے۔ پریم چند نے شانتی اور مفاہمت کا جو وسطی راستہ اپنایا تھا وہ مفاد پرست اور مطلب پسند سیاست دانوں کی ''دانشوری'' کی نذر ہو چکا ہے۔ اب واضح طور پر آہستہ روی، نرم خوئی اور مفاہمت کا ماحول نہیں رہا۔ احمد صغیر نے پریم چند کے نامکمل مشن کو آج کے دور میں وہ راستہ دکھایا ہے جس سے نصرت حاصل ہوسکتی ہے۔ ان کی کہانیاں کلاس وار کی عکاس ہی نہیں بلکہ ان سے پیدا شدہ مثبت نتائج کی بشارت بھی دیتی ہیں۔ انہوں نے جگہ جگہ جھوٹی Territorialism اور Regionalism کا مذاق بھی اڑایا ہے۔ انہوں نے انا، مُنکی، گلبیا اور بھیکو جیسے کرداروں کے ذریعے ہمیں ایسی کہانیاں بخشی ہیں جو فن کی سطح پر بھی سرشار کرتی ہیں اور ہمارے اندر وہ توانائی بخشتی ہیں جن سے ہم حالات کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ احمد صغیر نے بڑی ہنر مندی کے ساتھ اپنے لئے راستہ بنایا ہے۔ انہیں اسی راستے پر چلنا چاہئے۔

لیکن مجھے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان چند کہانیوں کے بعد انا کہاں غائب ہو جاتا ہے۔ اس نے جو جنگ شروع کی ہے وہ آگے چل کر سرد کیوں لگتی ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی دوسری کہانیوں میں بھی طبقاتی بیداری کی لہر موجود ہے۔ لیکن انا جیسا کردار کہیں نہیں ملتا۔ اسلئے آگ لہکتی نہیں دبی دبی سی لگتی ہے اور کہیں کہیں تو وہ اتنی تہہ نشیں ہو جاتی ہے کہ پریم چند یاد آ جاتے ہیں۔

ایک بات اور یہ کہ انقلاب کا بوجھ صرف انا جیسے چند کرداروں کے کاندھے پر کیوں رہتا ہے دوسرے لوگ اسے Share کیوں نہیں کرتے۔ خاص طور پر احمد صغیر کے یہاں نسوانی کردار، روایتی مجہولیت اور انفعالیت کے شکار کیوں نظر آتے ہیں۔ ان میں استحصال کے خلاف بیزاری تو دکھائی دیتی ہے مگر فعال بیداری نظر نہیں آتی۔ کیا عورت کا جہاد گُلبیا سے آگے نہیں بڑھ سکتا جو رنجیت سنگھ سے تنگ آ کر اپنے گاؤں واپس ہو جانا چاہتی ہے۔ [اوور ٹائم] یا یہ مریم تک محدود رہے گا جو دشمن سپاہی سے ایک مجاہد حاصل کر کے اپنی کوکھ میں محفوظ کر لیتی

ہے [جنگ جاری ہے]؟ میں نے احمد صغیر سے بہت سی توقعات وابستہ کر رکھی ہیں۔

ڈاکٹر محفوظ الحسن

احمد صغیر اُردو کہانی کا مستند نام ہے یا نہیں یہ تو وہ طے کریں گے جو تنقید کی مسندِ عالیہ پر تمکن ہیں اور جو فتویٰ صادر کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ میں یہ بھی دعوے سے نہیں کہہ سکتا کہ احمد صغیر ترقی پسند ہیں یا جدید یا مابعد جدید۔ کچھ کو ان کی کہانیوں میں ترقی پسندی نظر آتی ہے تو کچھ ان میں جدید عناصر کی تلاش پر زور دیتے ہیں اور کچھ ان میں مابعد جدید کی دید و دریافت پر زور دیتے ہیں۔ میرا ماننا تو صرف یہ ہے کہ احمد صغیر کھلی آنکھوں والا' وسیع النظر فنکار ہے جو اپنے مشاہدات اور تجربات کو کاغذ کے کینوس پر خونِ جگر کی روشنائی سے لکھتا ہے۔ جن کے یہاں ادبی قدریں اپنی پوری فنّی جمالیات کے ساتھ اپنے وجود کا احساس کراتی ہیں۔ احمد صغیر کی کہانیوں کے موضوعات معاشرے اور سماج کے ارد گرد پھیلے واقعات و حادثات ہیں۔ گذشتہ تین دہائیوں سے وہ متحرک اور فعال ہیں اور ان تین دہائیوں میں جو اور جس قسم کے واقعات' تحریکات ظہور میں آئی ہیں اس کے وہ صرف نہ چشم دید گواہ رہے ہیں بلکہ اس میں ایک باعمل کردار کی طرح انہوں نے اپنا رول ادا کیا ہے۔ اس دوران ان کے کئی افسانوی مجموعے اور ناول کے علاوہ تحقیقی وتنقیدی کتابیں اشاعت کے مرحلوں سے گذر کر ناقدین فکام اور قارئین کرام سے اپنے فکری وفنی رچاؤ کا اقرار واثبات کرا چکی ہیں۔

فی الوقت میرے پیش نظر ان کی ایک کہانی ''تعفن'' ہے۔ تعفن میں اس طبقے کی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے جسے عرف عام میں پسماندہ / دلت کہا جاتا ہے اور جس کی سب سے اہم اور بنیادی ضرورت اور اہم ترین مسئلہ بھوک ہے۔ ہمارا ملک ایک جمہوری نظام کے تحت چلتا ہے اس جمہوری نظام میں مساوات کو بنیادی حق کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے مگر یہ کیسا مساوات ہے کہ ایک بچہ عالیشان کوٹھیوں اور ایر کنڈیشنڈ کمروں میں زندگی گذارتا ہے دوسرا بچہ کوڑے کے ڈھیر پر پیدا ہو کر اسی کی نذر ہو جاتا ہے۔ یہ کہانی دراصل اس عدم مساوات اور سماجی نابرابری کے خلاف ایک حساس انسان کا قلمی جہاد ہے اور باشعور فنکار کا خاموش احتجاج۔ انسانی حقوق کے تحفظ کے لئے کئے جانے والے علانات' بچہ مزدوری کے خلاف حقوق اطفال کا دم بھرنے والی حکومت کی کارروائیاں محض دفتروں اور فائلوں کی نذر کیوں ہو جاتی ہیں۔ کیا جمہوریت میں مساوات کے یہی تقاضے ہیں؟ احمد صغیر کی یہ کہانی ان سوالات کا جواب بھی چاہتی ہے۔

کہانی میں تاثر پیدا کرنے کے لئے احمد صغیر نے تضادات کا سہارا لیا ہے۔ ویسے سچائی تو یہی ہے کہ زندگی کی ساری خوبصورتی تضادات میں ہی پنہاں ہے اگر اونچے محلات کے ساتھ ساتھ جھگی جھوپڑیاں نہ ہو تو زندگی کی بے ربطی اور بے کیفی کا احساس کیسے اور کسے ہوگا۔

کہانی منوا کے کوڑا چننے کے عمل سے شروع ہو کر خوشبوؤں سے بے ہوش ہونے پر ختم ہو جاتی ہے۔ کوڑا چننے کے عمل سے منوا کے بے ہوش ہونے تک داستان بہت دلچسپ بھی ہے اور حیرت فزا بھی۔ منوا جس کی ناک کوڑے کے تعفن کی عادی ہو چکی ہے گندگی جس کی خمیر اور ضمیر میں ڈھل چکی ہے وہ اس بھبھکے سے اس قدر Conditeand ہو گیا ہے کہ کوئی دوسرا بھبھکا یا خوشبو کا کوئی دوسرا جھونکا اس کی ناک برداشت ہی نہیں کر سکتی یہی وجہ ہے کہ صفائی' ستھرائی اور خوشبوؤں میں جب اسے نہلا دیا جاتا ہے تو وہ اسے برداشت نہیں کر پاتا اور بے

ہوش ہوکر فرش پر گر جاتا ہے۔ یہاں یہ سوال ہوسکتا ہے کہ کیا خوشبوؤں سے بھی کوئی بے ہوش ہوسکتا ہے؟ خوشبوئیں تو انسانی دل ودماغ کو معطر کرکے تخیل کی نئی بلندیوں تک لے جاتی ہیں مگر یہ کیا کہ منوا خوشبو سے ہی بے ہوش ہوگیا۔ نالی کے کیڑے کو صاف پانی میں کبھی زندہ رہتے ہوئے آپ نے دیکھا ہے؟ یہ ایک اہم نفسیاتی نقطہ ہے جسے احمد صغیر نے بڑی فنّی چابکدستی سے اختتام کو دلکش اور پر تاثر بنانے میں استعمال کیا ہے۔

کہانی کا پلاٹ بہت سیدھا سادہ مگر گٹھا ہوا ہے۔ منوا ایک پسماندہ/ دلت لڑکا ہے جو اپنی پسماندگی کا علاج کوڑوں کے ڈھیر میں تلاشتا ہے۔ کوڑے کے ڈھیر کی سڑاند بھری بدبو اس کے دماغ میں کس طرح رچ بس جاتی ہے کہ اس کا بھبھکا اسے اچھا اور خوشگور معلوم ہوتا ہے۔ وہ اس بو کے علاوہ اور کوئی بو محسوس بھی نہیں کرسکتا۔ اس بدبو نے اس قدر Conditand ہو جاتا ہے کہ دوسری کوئی بو اسے راس نہیں آتی ہے۔ جس کوڑے کچرے کے ڈھیر سے وہ اپنے لئے سامان زندگی تلاشتا ہے اسے ڈھیر کے کچھ دوری پر ایک بنگلے میں ایک عورت مسز ملکانی رہتی ہیں جو بے اولاد ہیں منوا کو کوڑا چنتے دیکھ کر ان کے دل میں طرح طرح کے خیالات سر اُٹھاتے ہیں۔ وہ کسی طرح اس سے قربت چاہتی ہیں۔ پہلے اُسے بلاتی ہیں۔ منوا ڈرتا ڈرتا ان کے پاس جاتا ہے۔ مسز ملکانی اس سے کچھ پوچھتی ہیں پھر اُسے کھانا دیتی ہیں۔ یہ کھانا دینے اور کھلانے کا عمل بھی دھیرے دھیرے دوری کی حدود کو عبور کرتا ہوا قربت کی سرحد تک پہنچ جاتا ہے اور بعد میں وہ گھر میں داخل ہو جاتا ہے۔ منوا کو مسز ملکانی کا اور ملکانی کو منوا کا انتظار رہنے لگتا ہے۔ آخر کار ایک وہ گھڑی بھی آجاتی ہے جب مسز ملکانی منوا کو گھر میں بلا کر نہلا دھلا کر ڈئنگ ٹیبل پر بٹھا کر خوشبوؤں میں نہا کر کھانا کھلانا چاہتی ہیں تو وہ بے ہوش ہو جاتا ہے۔

احمد صغیر نے مسز ملکانی اور منوا کے کردار کی تراش خراش میں جس ہوشمندی سے کام لیا ہے وہ فن پر ان کی گرفت کا ثبوت ہے۔

مسز ملکانی ایک امیر کبیر عورت ہیں۔ آرام و آرائش کے سارے سامان موجود ہیں مگر اس زندگی میں ایک خلاء ہے اور وہ ہے اولاد کی نعمت سے محرومی۔ منوا کو کوڑا چنتے دیکھ کر مسز ملکانی کا ممتا کا جذبہ اسے منوا کی جانب متوجہ کرتا ہے۔ ابتداً وہ منوا کو دور سے دیکھ کر ممتا کی پیاس بجھاتی ہے۔ پھر اسے پاس بلاتی ہے۔ کھانا کھلاتی ہے۔ پہلے یہ کھانا ہاتھ میں تھما دیا جاتا ہے پھر اخبار پر دیا جاتا ہے پھر پلیٹ میں اور آخر میں منوا کا داخلہ گھر میں ہو جاتا ہے۔ مسز ملکانی اسے دیکھ کر' اسے کھلا کر' اپنے پاس بلا کر' اپنے ممتا کے جذبے کو تسکین پہنچاتی ہیں۔ اس کے دل میں یہ خواہش بھی جنم لیتی ہے کہ کسی طرح وہ منوا کو اپنا لے۔ منوا کو نہلا دھلا کر ڈائننگ ٹیبل پر بٹھا کر' خوشبو میں نہا کر وہ اسے اپنے جیسا بنانا چاہتی ہے مگر منوا اس خوشبو کے جھونکے کو برداشت نہیں کر پاتا اور کھانے سے پہلے ہی بے ہوش ہو کر گر جاتا ہے۔ اسی طرح منوا کے برتاؤ میں بھی تبدیلی رفتہ رفتہ زینہ بہ زینہ ہی آتی ہے۔ پہلے وہ ڈرتا ہے۔ پھر جھجھکتا ہے' پھر قریب آتا ہے۔ پہلے وہ للچائی نظروں سے دیکھتا ہے' پھر اسے کھانے کا انتظار رہنے لگتا ہے اور بعد میں وہ وقت پر حاضر ہونے لگتا ہے۔ دونوں کے ملن کے محسوسات بھی الگ الگ ہیں۔ منوا اور مسز ملکانی کی جانب اپنی شکم پری کی وجہ سے متوجہ ہوتا ہے اور مسز ملکانی اپنے جذبۂ ممتا کی تشنگی کو بجھانے کی خاطر۔ دونوں کی قربت خاص غرض سے ہوتی ہے مگر دونوں ایک دوسرے کی غرض سے ناواقف رہتے ہیں یا ناواقف رہتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ معاملہ خواہ جو بھی ہوا احمد صغیر نے ان دونوں کرداروں کو فطری جذبے کے ساتھ ایک دوسرے کی جانب متوجہ ہوتے دکھایا ہے جو کہانی کا تقاضہ بھی ہے۔ احمد صغیر مسز

ملکانی سے منوا کو ڈانٹ ڈپٹ اور جھڑکتے ہوئے بھی دکھا سکتے تھے اور منوا کو مسز ملکانی کو دیکھتے ہی بھاگتے ہوئے بھی دِکھا سکتے تھے۔ مگر اس سے کہانی کا فطری ارتقاء اور فنّی تقاضہ پورا نہیں ہوتا۔ احمد صغیر کا یہ عمل انتہائی فنکارانہ ہے۔

منظر نگاری اور Situations کے امتزاج سے احمد صغیر نے اس کہانی کا تانا بانا اس طرح بنا ہے کہ پلاٹ کٹھیلا ہو گیا ہے کہیں سے کوئی چول ڈھیلی پڑتی نظر نہیں آتی۔ واقعات کی ترتیب و تنظیم بڑی ہوشمندی سے کی گئی ہے اور مکالمے کو اس قدر چست اور درست رکھا گیا ہے کہ کہیں سے کوئی انگلی اٹھانے کی گنجائش نہیں رہتی ہے (حالانکہ مکالمہ بہت کم ہے)۔ واقعات کے تسلسل سے بیانیہ کو زوردار بنایا گیا ہے۔ کہانی کے اختتام پر مجھ جیسے قاری کو دونوں کرداروں سے ہمدردی ہو جاتی ہے۔ منوا سے ہمدردی تو فطری ہے مگر مسز ملکانی سے اس کے رویہ اور برتاؤ کی وجہ سے ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ منوا کے ساتھ مسز ملکانی کا رویہ بے غرض نہیں مگر یہ بھی ذہن نشیں رہے کہ منوا جھکاؤ بھی بر بنائے خلوص نہیں بلکہ اس کی شکم پری کی غرض ہے۔ مگر یہ ساری باتیں اندر کی ہیں، باہر کی بات تو یہ ہے ایک امیر زادی بچے کی جانب نگاہ خلوص و ہمدردی دیکھتی ہے۔ جو آج کے معاشرے کا کھلا ہوا تضاد ہے۔ مگر اس تضاد سے احمد صغیر نے کہانی میں فنکارانہ حسن پیدا کیا ہے۔

احمد صغیر کی کہانیوں کا عام موضوع معاشرہ، سماج اور اردگرد کا ماحول ہوا کرتا ہے۔ احمد صغیر اپنی کہانیوں میں پسماندہ، محروم اور مظلوم و مجبور طبقے کو زبان دیتے نظر آتے ہیں۔ سو اس کہانی میں بھی ان کا یہی رویہ برقرار ہے۔

یہ کہانی آج کے ترقی یافتہ، مہذب سماج کے منہ پر ایک زبردست تمانچہ ہے اور حکمرانوں کے لئے عبرتناک سبق۔ احمد صغیر کی یہ کہانی اپنے اختتام پر یہی کہتی نظر آتی ہے کہ۔

شائد کہ میرے دل میں اتر جائے میری بات

اور آخری بات ''تعفن'' دراصل میرے خیال میں استعارہ ہے ہمارے سڑے ہوئے سماج کا جو کوڑے کی ڈھیر کی طرح ہے اور منوا اس تعفن زدہ سماج کا ایک آئینہ ہے اور مسز ملکانی اس آئینہ کا دوسرا رخ۔

ڈاکٹر مثنیٰ رضوی

''اناّ کو آنے دو'' احمد صغیر کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اردو کے جدید ترین افسانوی ادب میں اُن کا نام خاصا جانا پہچانا ہے۔ اُن کے افسانوں میں احتجاج کی جو تیز لہر پائی جاتی ہے وہ اُن کی شناخت بن چکی ہے۔ اس مجموعہ میں بھی وہ لہر پوری آن بان سے موجود ہے۔ اُن کی کہانیوں میں زندگی کی جو جھلکیاں نظر آتی ہیں وہ زمینی سچائیوں سے آٹوٹ رشتہ رکھتی ہیں۔ اُن میں رنگین اور پراسرار تصورات کے محل نہیں دکھائی دیتے۔ اُن کی کہانیاں زمین سے اس طرح جڑی ہوتی ہیں کہ ہم عوامی زندگی کے سماجی، معاشی اور تہذیبی مسائل سے الگ کر کے اُن کا مطالعہ کر ہی نہیں سکتے۔ اُن کا دماغ سوچتا ہے تو اُن کا دل بھی دھڑکتا ہے۔ اُنھوں نے اپنی کہانیوں کا تانا بانا سنگین معاشرتی اور مادی حقائق کے شعور اور احساس کے وسیلہ سے بُنا ہے اور اس کام کو انھوں نے اتنی فنی چابکدستی اور ہنرمندی کے ساتھ کیا ہے کہ اُن کی اکثر کہانیاں ایک اکائی کی شکل میں اُبھر کر قارئین کے دل و دماغ کو چھو لیتی ہیں۔ کہیں جھول نظر نہیں آتا تار و پود بکھرتے نظر نہیں آتے لفظوں

کا فضول اور بے جا صرف نہیں ملتا اور سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ کئی کہانیاں کسی مرکزی خیال یا تاثر کی گرفت میں رہنے کی بدولت فنی اعتبار سے بڑی موثر اور خوبصورت کہی جانے کی مستحق قرار پاتی ہیں۔ بعض کہانیاں ایسی بھی ہیں جن پر صحافتی رنگ غالب آ گیا ہے اور لہجہ خطیبانہ محسوس ہوتا ہے مگر اُن کی تعداد زیادہ نہیں۔

اس مجموعہ کی کی بعض کہانیاں عہد حاضر کے انتہائی اہم مسائل سے بنرد آزما ہیں۔ طبقاتی کشمکش اور جد و جہد نے اتنی شدت اختیار کر لی ہے کہ خوف اور دہشت کے سائے چاروں طرف لرزاں نظر آتے ہیں۔ آیئے ذرا اس کہانی پر ایک سرسری نظر ڈالیں جس سے یہ مجموعہ موسوم ہے میری مراد ''انّا کو آنے دو'' سے ہے۔ پھلمتیا ایک دبی کُچلی مظلوم عورت ہے جس کے گاؤں کے پانچ پانچ افراد کو محض اس لئے موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا کہ اُنہوں نے کارومستری کے گھر میں جنم لیا تھا جنہوں نے عدالت میں گاؤں کے مکھیا کے خلاف سچّی گواہی دیدی تھی۔ پورا گھر جلا کر خاکستر کر دیا گیا تھا۔ پھلمتیا کی پھول سے بچّی بھی جھلس گئی تھی۔ انّا نام کا ایک نوجوان جو ظلم اور استحصال کے خلاف لڑنے کے لئے اپنی جان کی پروا کئے بغیر سینہ تان کر میدان میں اتر آیا تھا جُرات اور بے با کی جوش اور ولولہ کی علامت بن کر گاؤں کے ستم زدہ لوگوں کا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔ دہشت اور خوف کے اس اندھیرے میں وہ اُمید کی کرن بن کر چمکا تھا۔ پھلمتیا اس کے بارے اس طرح سوچتی ہے:

''کیا اکیلا کوئی انّا اس نظام کو بدل دے گا یا ہر گھر میں ایک انّا کا وجود اب لازمی ہے؟ ہر گاؤں ہر قصبہ اور ہر گھر میں انّا کی ضرورت ہے جو موجودہ نظام کو بدلنے میں معاون ہو سکے لیکن اس قدر انّا آئیں گے کہاں سے؟ برسوں میں صرف ایک انّا پیدا ہوتا ہے اور بس ایک دن میں اسے ختم کر دیا جاتا ہے یا جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا جاتا ہے۔ تو کیا ہر ماں کو ایک انّا......؟''

پھلمتیا یہ سوچ ہی رہی تھی کے اس نے جیپ پر سوار دو طاقت اور غرور کے نشہ میں چور جوانوں کو یہ کہتے سنا— ''بڑے نکسلائٹ بنتے ہیں سالے۔ ایک ہی رات میں ٹھنڈے پڑ گئے''— پھلمتیا نے چلّا کر کہا کہ ''انّا کو آنے دو''۔ طبقاتی جد و جہد کیا رنگ لا رہی ہے اور کس طرح گاؤں کی ایک مجبور بے بس عورت کی نفسیات کو تیزی سے بدل رہی ہے یہ سب کچھ محض ایک فقرہ میں سمٹ آیا ہے۔ یہ کہانی احمد صفیر کے فکری اور فنی شعور کا ایک خوبصورت آئینہ ہے۔

اب ذرا طبقاتی کشمکش پر ہی مبنی ایک دوسری کہانی پر طائرانہ نگاہ ڈالیں جس کا انداز کسی قدر مختلف ہے۔ ''پیاسی ہے زمیں پیاسا آسماں'' ایک ایسی کہانی ہے جس میں منکی نام کی ایک غریب عورت نشی نام کی ایک خوش حال خاتون کے گھر میں ملازمہ ہے وہ اپنے آوارہ اور شرابی شوہر کی مار پیٹ سہتے ہوئے اس نوکری کے ذریعہ اپنے بچوں کا پیٹ پالتی ہے ایک دن بچے کو دودھ نہیں مل پایا اس لئے وہ لگاتار رو تا رہا کسی طرح چُپ ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا مُنکی نے اپنی مالکن کو اپنی مجبوری بتائی اور تھوڑا سا دودھ بچے کے لئے مانگا مگر وہ بہانہ بنا کر ٹال گئی۔ بچے کے لئے انکے یہاں دودھ نہیں تھا لیکن گنیش جی کی پیاس بجھانے کے لئے انہوں نے منکی کو پورا گلاس بھر کر دودھ دے دیا۔ مُنکی گنیش جی کو دودھ پلانے کو جاتے ہوئے سوچنے لگی اگر آج بھی دودھ والا نہیں آیا تو پھر میرا بچہ......!

اس کے قدم رکنے لگے......

گنیش جی کو پلانے کے لئے مالکن کے کچن میں دودھ نکل آتا ہے مگر میرے بچے کے لئے؟ منکی رک گئی اس نے ایک نظر مندر کی

طرف جاتی بھیڑ کو دیکھا، کچھ سوچا اور پھر دھیرے سے اپنے گھر کی طرف مڑ گئی۔

اس خوبصورت افسانہ میں خوش حال طبقہ کی کھوکھلی اور دردمندی سے عاری مذہبیت کا پردہ بغیر کچھ کہے ہوئے محض واقعات کی بنت سے فاش ہو جاتا ہے۔خوش حال اور صاحب اقتدار طبقہ کی یہی ذہنیت اور سنگدلی طبقاتی آویزش کو جنم دیتی ہے اور زندگی کو دہشت اور سراسیمگی کی آماجگاہ بنا دیتی ہے۔آیئے اب اس کہانی کی بات بھی ہو جائے جو''کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے'' دہشت اور روز روز کے خون خرابہ سے عاجز آئے ہوئے لوگوں کی نفسیات کا یہ اچھا مطالعہ ہے۔میڈیا والوں سے اپنا دُکھڑا بیان کرتے کرتے گاؤں والے بے حسی کا شکار ہو گئے ہیں۔ایک کہانی کار کو دیکھ کر گاؤں کی لڑکی اسے اخبار نویس سمجھ بیٹھتی ہے اور اُلجھے ہوئے لفظوں میں اپنی بیزاری کا اظہار کرتی ہے:۔

کوی اکھبار والے ہوں گے؟ ای کھبر چھاپوگے کہ ای جگہ بڑا کھون کھرابہ ہوا ہے۔پھوٹو بھی۔بس''

کہانی کار کا حال بھی سنئے!

میں اپنا زخمی دل لئے لوٹ آیا ہوں۔کاغذ کے اوراق میرے ٹیبل پر بکھرے پڑے ہیں۔قلم میرے ہاتھ میں ٹھہرا ہوا ہے اور ذہن میں وہ سارا منظر ہے۔کہانی بھی ختم نہیں ہوئی ہے۔جب تک میں ایک کہانی مکمل کر رہا ہوں گا کوئی دوسرا گاؤں جل اُٹھے گا۔

ناانصافی، جبر واستحصال اور ناداری سے آنکھیں چار کرتی ہوئی ان افسانوں سے خاصی مختلف نوعیت کی کچھ کہانیاں بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں جیسے''اورٹائم''''اندھیرے جاگتے ہیں'' جن میں گلبیا اور عالیہ کی بے بسی اور بے اطمنانی کو افسانہ نگار نے سماجی اور معاشی نا برابری کے تناظر میں دیکھا ہے یا''سایہ'' جس میں برسوں کی تھکن اور پامالی طاقت اور خود اعتمادی بن کر رنجنا کی شکل میں اُبھری ہے اور اعلان کر رہی ہے کہ عورت مرد کے سہارے کے بغیر بھی جی سکتی ہے۔

احمد صغیر کی تخلیقات میں ارضی حقائق اور طبقاتی کشمکش کا جو شعور ملتا ہے وہ اُن کی فن کارانہ صلاحیت اور جوہر کے امتزاج سے بعض کہانیاں نئے آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہوا ہے لیکن اُنہیں اپنی اصل منزل تک پہونچنے کے لئے ابھی کڑی محنت کرنی ہے۔طرز اظہار اور اسلوب بیان کے نئے امکانات تلاش کرنے ہیں سادگی کو پُرکاری عطا کرنی ہے اور زبان پر قدرت حاصل کرنی ہے۔اُن کی کہانیاں جن مسائل سے برسرِ پیکار ہیں وہ بڑے اہم سنگین اور پیچیدہ ہیں اُن کو گرفت میں لانے کے لئے جن مراحل سے گزرنا ہے وہ بڑے کٹھن ہیں لیکن وہ جس عزم اور استقلال کے ساتھ اپنی راہ پر گامزن ہیں اُسے دیکھتے ہوئے بجا طور پر توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں کامیاب ہوں گے۔

حقانی القاسمی:

''انا کو آنے دو'' کے بارہ افسانے ہماری بارہ راتوں کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں۔یہ دراصل وہ بارہ چشمے ہیں جو تخلیقی ذہن کی ضرب سے فکشن کے دریا میں پھوٹ پڑے ہیں۔یہ چھوٹے چھوٹے بارہ دائرے ہیں جن میں فکشن کے موج صد رنگ کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ان افسانوں میں''انا کو آنے دو'' مرکزی کہانی ہے اور یہ کہانی ایک نئی زمین، نئے آسمان، نئے چاند سورج اور نئے ستاروں کے جلو میں لکھی گئی

ہے۔کہانی مختصر سی ہے مگر اس کا تاثر بہت گہرا ہے۔پھلمتیا اس کا ایک ایسا کیرکٹر ہے جسے اگر اور مانجھا گیا تو ہوری کی طرح کسی دن ایک زندہ کردار بن جائے گا۔دوسرا کردار اَنّا ،ایک علامت ہے مزاحمت اور مقاومت کی، جدوجہد اور بغاوت کی، سماجی سیاسی نظام کو بدلنے والے ایک انقلابی انسان کی۔

احمد صغیر کی کہانیوں کی خوبی یہ ہے کہ ان کی کہانیوں میں نئی برق تجلی دیکھنے کو ملتی ہے۔عذاب روشنائی سے لکھی،ان کی کہانیوں کے سینے میں جو آگ ہے، وہ کاغذ پہ پھیلتی نظر آتی ہے۔احمد صغیر،آج کے افسانہ نگار ہیں،اس لیے ان کے مسائل اور وقوعے بھی آج کے ہیں۔ان کے تخلیقی اضطراب اور تحرک کو ان کے افسانوں میں بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔کہانی کیسے لکھی جاتی ہے،اس آرٹ سے احمد صغیر آشنا ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیوں میں نہ ابہام ہے، نہ اہمال اور نہ اغلاق اور نہ ان کی کہانیاں ترسیل کی ناکامی کی نذر ہوتی ہیں۔زمین اور ارضی مسائل و متعلقات سے ان کا گہرا ارتباط،ان کی کہانیوں کو فنی اور فکری جہتوں سے آشنا کرتا ہے۔احمد صغیر کے سینے میں ’دہشت‘ کی نہیں ’درد‘ کی جوالا بھڑک رہی ہے اور یہی جوالا ان کے نظامِ فکر و فن اور اظہاری جمالیات کو روشن رکھتی ہے۔ان کے افسانے،ایک خاص تناظر اور سیاسی سیاق و سباق میں لکھے گئے ہیں۔بہار کے مخصوص سیاسی سچویشن سے شناسائی کے بغیر ان کے فکشن کی تفہیم،تفسیر و تقطیر ممکن نہیں۔

احمد صغیر کی کہانیاں بہت مختصر مگر بہت ہی معنی خیز ہوتی ہیں۔ان کہانیوں کا جو علاقائی تناظر اور مقامی تشخص ہے، یہی تناظر اور تشخص ان کہانیوں کو نئی معنویت،نئی وسعت اور آفاقیت عطا کرنے کے لیے کافی ہے۔جب تک علاقائی جڑوں کی تلاش کی کوشش نہیں کی جائے گی تب تک کوئی بھی ادب آفاقی نہیں ہو سکتا۔علاقائیت کی کوکھ سے ہی آفاقیت جنم لیتی ہے اور احمد صغیر نے اس رمز کو سمجھ لیا ہے۔اس لیے وہ ایسی کہانیاں لکھتے ہیں جس سے اردو فکشن کو ایک نیا ڈائمنشن ملے اور ایک ایسا نیا کنوارا تناظر جو دوسروں کے ذہن میں واضح نہ ہو۔نئے تناظر کی یہ کہانیاں، اردو فکشن کو وسعتوں اور رفعتوں کی نئی منزلیں عطا کریں گی، یہ میرا گمان ہے۔کیا عجب کہ کبھی یہ گمان، یقین میں بدل جائے—!!

(ایوانِ اردو مارچ 2002)

فیاض احمد وجیہہ

انتخاب کا پہلا افسانہ ’’انّا کو آنے دو‘‘ سادہ بیانیہ ہونے کے باوجود کئی جہتوں میں چھلانگ لگاتا ہے گویا کہ Narration کی مکمل تعریف وضع ہو جاتی ہے۔اس کے تلازموں پر غور کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ احمد صغیر Viewer-Watcher کے طور پر جنسی تشدد، کرپٹ سسٹم، گاؤں کے سرغنہ کے خلاف حق گوئی کی جرأت اور اس کا دل دہلا دینے والا انجام وغیرہ پر ایک معصوم انسان کی نظر کو ترجیح دیتے ہوئے اپنی راہ نکالی ہے۔ظاہر ہے میرے مذکورہ نکات کا انسلاک موضوع سے ہے۔مگر اس کی تفہیم میں جائیے تو کہنے کو مصر ہونا پڑے گا کہ ان کو فلسفی بننا قطعی پسند نہیں ہے۔آس پاس کی دنیا اور ہم عصر سماج کی سچائی پیش کرتے ہوئے صغیر ہر طرح کی مصلحت پسندی کی نفی میں خلاقانہ صلاحیت کا بے انتہا درک رکھتے ہیں۔یہ الگ بات ہے کہ ان کے یہاں چھوٹی سچائیاں بھی وسیع تر مفہوم سے ہمکنار ہیں۔پیش نظر متن کی قرأت میں راوی کی جو تصویر ہمارے ذہن میں منعکس ہوتی ہے۔اس کے سہارے احمد صغیر پر بہ آسانی باغیانہ تیور کی مہر ثبت کی جا سکتی

ہے۔ چنانچہ س تیور کا مثبت پہلو یہ ہے کہ سماج اور حکومت کی خود ساختہ لاقانونیت کو درست یا نادرست گردانا بہت اہم مسئلہ نہیں ہے۔ اسی کے باعث ان کا فن کار اجتماعی لاشعور کی فطری سوچ کو مہمیز کرنے کے لئے اندر کے انسان کی تربیت پر اصرار کرتا ہے۔ احمد صغیر کے اس تخلیقی رویّے کے سبب ہی ان کی باغیانہ فکر انسانی تمکنت کی اصلیت سے ہم آمیز ہو جاتی ہے اور ان کی مجموعی آئیڈیالوجی کے ایک اہم عنصر کے طور پر یہ بتلانے میں بھی معاون ہوتی ہے کہ صغیر Outward appearance کا کہانی کار ہوتے ہوئے بھی اپنی پرت In ward appearance میں ہی کھولتے ہیں۔ اس طور پر جاننا ہی چاہئے کہ نکسلائٹ کا عام تصور ان کو بے چین کیوں کرتا ہے۔ یہاں پر ٹھہر کر یہ بھی کہنا چاہئے کہ صغیر نے اپنی بے اطمینانی میں عصری فریسٹریشن کی ایک خاص شکل کو نمایاں کرتے ہوئے ایک نمائندہ کردار ''پھلمتیا'' کو پیش کر کے سوالیہ نشان قائم کر دیا ہے۔ یہاں جاننے والی بات یہ ہے کہ ان کا یہ کردار جنس کے اعتبار سے نسوانی ہی کیوں ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کردار کے حوالے سے ایک الگ بحث درکار ہے۔ چوں کہ صغیر کا فکری دائرہ یہاں پر ایک ایسے زیر و بم کی دریافت کرتا ہے۔ جو انسانی سماج کی تعمیر و تشکیل میں بحث کے نئے دریچے بھی وا کرتی ہے ار ان کی ذہنی زمین کا آئینہ بھی پیش کرتی ہے۔ بلا شبہہ احمد صغیر نے اس کردار کی تربیت میں جدید انسان کی گاتھا بیان کی ہے۔ دراصل ان کو باطن کی وہ بینائی میسّر ہے جو اپنی روایت کو بھی جانتا ہے اور موجودہ عصر کی تگ و تاز سے بھی واقف ہے اس طور پر تعجب نہیں ہونا چاہئے کہ آج کا معصوم مفلس اور ظلم سہنے والا فرداتّا جیسے کردار میں ہی انسان کی نیک نفسی کو کیوں محسوس کرتا ہے۔

ان کا دوسرا افسانہ ''پیاسی ہے زمیں، پیاسا آسمان'' کو بھی بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے چوں کہ احمد صغیر نے دھارمک فلسفہ کی عام ذہنیت کی اساس میں جدید سوسائٹی کی جس طور پر گرہ کشائی کی ہے۔ وہ ان کی ہنرمندی کا چیدہ ثبوت ہے۔ دراصل انسانی جذبوں کو اُجاگر کرتے ہوئے ان کا کردار فوری ردعمل کا بھی عادی ہے اور سکوت کی اس دنیا کا بھی پروردہ ہے جس میں Slice of life کی توانا صورت (احتجاجی شکل) کا مثبت رویہ سامنے چلا آیا ہے۔ معاصر فکشن نگاروں نے مذہبی فلسفہ کا مطالعہ جن عوامل کے درمیان کیا ہے اس کا بے حد روشن پہلو احمد صغیر کو بھی میسر ہے۔ چنانچہ اعلیٰ سوسائٹی کی نمائندہ کردار 'نشی' کا دو چہرہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ انسان مذہبی آستھا کے دائرے میں اپنا انسانی چہرہ پیش کرنے کے باوجود انسانی برادری کا فرد نہیں گردانا جا سکتا ہے۔ چوں کہ ہمارے آس پاس اپنے خول میں سمٹا ہوا وجود خدائی سماج کا پروردہ ہے۔ اس کی جھوٹی انا پر طنز کرتے ہوئے احمد صغیر نے 'مُنکی' جیسے کردار کی دریافت کی ہے تو کہنا چاہئے کہ انہوں نے اپنے مافی الضمیر کو بروئے کار لاتے ہوئے دردمندی اور نیک نفسی کا راگ محض نہیں الاپا ہے۔ بلکہ مندر جاتے ہوئے ممتا کا بیدا رہونا اور لوٹ آنا اس افسانے کا راست واقعہ بھی ہے اوا س انسانی ڈگر کی کھوج بھی، جو مذہب کی بے حد سچی تعریف وضع کرتی ہے۔ بے حد فطری اور سچی تصویر پیش کرتے ہوئے اتنی تہہ داریت پیدا کرنا ہر کس و ناکس کے بس کا روگ نہیں ہے۔ پھر کہنے دیجئے کہ ان کے افسانوں میں معنوی خلاء کے درمیان سے ہی اصل واقعہ جھانکتا ہے۔ اس افسانے میں بھی نسوانی کرداروں کے تعلق سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ صغیر کا فکری رویہ واقعات کی بُنت میں عورت کو اتنی اہمیت کیوں دیتا ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں انسانی نفسیات کو بیان کرنے میں ان کا کہانی کار کسی طور پر دروغ گوئی سے کام لینا نہیں چاہتا۔ اپنے طور پر اس تفہیم کے بعد میں پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ صغیر کی

سادہ بیانی میں سادہ پن کا شائبہ تک نہیں ہے۔

ان کے افسانہ ''اُوور ٹائم'' کو ذہن میں رکھئے تو کہنے میں آسانی ہو جاتی ہے کہ ان کی نگاہ آج کی ہوس پرست سوسائٹی پر بھی ہے۔ حالاں کہ اس موضوع کا انسلاک ہماری روایت سے بھی پورے طور پر ہے۔ چنانچہ ''گلبیا'' جیسی روایتی اور Symbolic کردار کو موجودہ عصر میں جس طور پر نمایاں کیا گیا ہے۔ اس میں بڑی معنی خیزی ہے۔ دراصل واقعات کی بُنت میں آنے والی نسل کی غیر تحفظی کا احساس جس فکری رویےّ پر اصرار ہے۔ اس میں صرف ذات کی نوحہ خوانی نہیں ہے بلکہ پدری نظام کے ایک خاص کردار کی پورے طور پر نفی بھی ہے۔ چوں کہ صغیر لفظیات کے دائرے میں محض واقعہ بیان کر کے یک رُخا پہلو برآمد نہیں کرتے بلکہ سادہ لفظوں میں انسانی قدروں کو اس طور پر اُبھارتے ہیں کہ اپنے آپ ایک نیا افسانہ قاری کے ذہن میں جنم لے لیتا ہے۔ اس طور پر جاننا چاہئے کہ جہاں ایک بات کہہ کر اطمینان حاصل کر لینا بھی صغیر کا وصف ہے وہیں دوسری باتوں کی زمین تیار کر دینا ان کا بیحد منفرد تخلیقی حصہ ہے۔

''کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی'' راوی کا دردمند دل جس طور پر موجود ہے وہ صغیر کے بعض ماقابل افسانوں کی فضا بھی ہموار کرتی ہے اور ان کے ذہنی عمل کو بھی پیش کرتی ہے حالاں کہ اس طور پر افسانہ لکھنا بیشتر کہانی کاروں کی فنی اور فکری ناکامی کو ہی سامنے لاتا ہے پھر بھی ان کی ہنرمندی بہتر ڈھنگ سے ظاہر ہوئی ہے۔

احمد صغیر کی کہانیوں کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے بعض جگہوں پر مایوسی بھی ہاتھ لگی ہے اس کے باوجود ان کی ہنرمندی کو کس طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ میں یہاں مشورتاً عرض کرنا چاہتا ہوں کہ احمد صغیر اگر اپنے کرداروں کی زبان اور پس منظر کا خاص خیال رکھیں تو ان کے افسانوں کی فنی اور فکری جہت مزید مستحکم ہو جائے گی۔ ویسے ان کے افسانوں میں جن نسوانی کرداروں سے سابقہ پڑتا ہے وہ صغیر کا مافی الضمیر ہے۔ ان کرداروں کے حوالے سے سماج پر طنز کا پہلو بھی ان کو میسر ہے اور جدید معاشرے میں نئی قوت کے نمو کی فکری جہت بھی۔ اس طور پر کہتا چلوں کہ معاصر فکشن نگاروں میں احمد صغیر کے علاوہ اقبال حسن آزاد، مجیر احمد آزاد اور ثروت خاں وغیرہ کے نسوانی کرداروں پر الگ سے بحث کی جائے تو تانیثیت کی گفتگو میں نئے باب کا اضافہ ہوگا۔ بہرکیف احمد صغیر کے کہانی کار کی دریافت (میری خوش فہمی) کے باعث مجھے کہنے دیجئے کہ ان کے یہاں ایک ایسا ننھا بالک (کہانی کار) نواس کرتا ہے جو عورت کو زندگی کا استعارہ جانتا ہے۔ شاید اسی لئے انہوں نے اپنی کہانیوں میں عورت کی گاتھا بیان کر کے معاشرے کی دریافت کی ہے۔ یہ معاشرہ ایسا لفظ ہے جس میں صغیر کے تمام موضوعات سمٹ کر آ جاتے ہیں ان کے بیشتر افسانے سماجی ہیں لیکن نفسیاتی پہلو کو محو کر کے ان کی تفہیم ادھوری ہوگی۔ میں نے سیاسی لفظ کا استعمال شعوری طور پر نہیں کیا ہے چوں کہ انہوں نے اس کی نئی تعبیر اپنے افسانوں میں متعین کی ہے۔ ان کی بعض ہنرمندی کو ذہن میں رکھئے تو کہنا پڑے گا کہ صغیر اپنے افسانوں میں خارجی حقیقت سے داخلی حقیقت کی طرف سفر کرتے ہیں اور ایک پڑاؤ بنا کر پھر اپنے نکتہ آغاز کو سامنے کر دیتے ہیں۔ ان کے تجربوں کی قرأت میں قاری کی تمام توجہ کرداروں کے ذہن و شعور پر مرتکز ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر نسیم ابن ضمد

احمد صغیر نے تمام تر علامتی اور تجریدی معنویت پر استعاراتی اصطلاح کے استعمال کے باوجود اپنی کہانیوں کو افسانوی صورت بخشنے اور اسے

برقرار رکھنے کی کامیاب ترین سعی کی ہے گویا ان کے افسانے مکمل علامتی اور تشبیہات نیز استعاراتی ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ میں افسانے کے تمام لوازم سمیٹے ہوئے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیوں میں پلاٹ کی زیریں لہریں موجزن اور کارفرما ہیں جو اپنی تازگی اور توانائی کا احساس دلانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتیں۔ وہ اپنے تجربات، اپنے تخیل یا فکر و خیال اور محسوسات کی ترجمانی یا ترسیلی کیفیت کا استعمال کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ آج کے تناظر میں افسانے فوراً سمجھ میں آجاتے ہیں اور قاری قطعی الجھاؤ یا الجھن محسوس نہیں کرتا اسکے افسانے اپنے تمام تر حقائق اور جزئیات نگاری کے سبب قاری کے ذہن کو اپنی جانب متوجہ کر لینے میں حد درجہ کامیابی کے درپے ہیں۔ انہوں نے اپنے تقریباً تمام کہانیوں میں عصر موجود کے معاشرے کی جھلکیاں، تصویریں، مرقعے اور تقاضے نیز دردمندی، ظلم و ستم، استحصال، دہشت و تشدد، خوف و ہراس اور اندیشے کی واضح عکاسی کی ہے۔ گویا ان کے تینوں مجموعوں کے بیشتر افسانے اپنے گرد و پیش میں رونما ہونے والے واقعات و سانحات پر مبنی اور مشتمل ہیں۔ جو دورِ حاضر کے جیتے جاگتے حادثات و واردات کے امین بھی ہیں ور تاریخی نوعیت کے منظر نامے بھی۔

یہ صحیح ہے کہ 1980 کے بعد اردو افسانہ علائم و استعارات سے قریب تر ہوتا چلا گیا جس کی الجھن نے قاری کو حیران و ششدر کر دیا اور جسے فنکار اور صنف افسانہ اور استعارات اردو افسانے کے لئے بظاہر زیر تو بن گئے لیکن ڈاکٹر احمد صغیر جیسا جیالا فنکار زہر کو بھی امرت بنانے کے ہنر سے واقف تھا۔ انہوں نے اپنی ہنر کاری، بہترین صناعی اور تیز تخلیقی عتوج اور عمدہ فنی متخیلہ قوت کر بڑے بہترا انداز میں Treat کرنے کی کدوکاوش کی جوان کی فلسفیانہ بصیرت کی دلیل بھی ہے اور تخلیقی محرک کی امین بھی۔ وہ اپنے قاری کو افسانے کی ارتقائی صورتحال اور منزل کی آخری سرحد تک رسائی کرانے اور ایک خیال روشن کر جانے کی تقریباً کامیاب سعی کرتے ہیں تا کہ قاری کچھ دیر تک پیدا ہونے والے تاثر سے محفوظ ہوتا رہے۔ بالقیں ان کی کہانیوں میں پُر تاثر گہرائی ہے۔ ان کے افسانوں سے یہ عیاں ہے کہ وہا اپنے راستے بدلتے اور پہلے سے زیادہ بہتر نہج اختیار کرکتے رہے ہیں۔ ان کی سعی اور اعتماد نے ان کو ایک ایسی منزل تک پہنچا دیا ہے جو ان کی اپنی پیدہ کردہ منزل ہے۔ اس لحاظ سے اردو جدید افسانوں میں ان کی حیثیت ایک سنگ میل کی ہوگئی ہے اس چیز نے ان کو دوسروں سے ممتاز غیر کر دیا ہے اور وہ درازیٔ قد کے ضامن بن گئے ہیں.........۔ اس نقطۂ نظر سے ڈاکٹر احمد صغیر کے متعلق یہ پورے نبض کے ساتھ کہا جا سکتا ہے انہوں نے افسانے کے جدید تکنیک، نئے انداز اسلوب، غیر مبہم علامات و استعارات، تشبہات و استعارات اور تراکیب الفاظ کے توسط سے افسانے کی کہانویت اور اس کی روح کو ہمہ دم باقی رکھنے کی کوشش میں خاصے کامیاب رہے ہیں۔ ان کی یہ کامیابی و کامرانی اس بات کی دلیل ہے وہ اپنے افسانوں میں ماحول و فضا کی عکاسی، کرداروں کی کردار نگاری اور لب و لہجہ کی برجستگی، جملوں کی ترتیب و تزئین اور تاثرات کی اثر فرینی تیز نگارہ دور بینی کی کیفیت قائم رکھنے میں کامیابی کی بلندیوں کو چھو لیا ہے۔

صغیر احمد کی پختہ فہمی، اس حقیقت کے آئینہ دار ہے کہ نئی تحریک، نئے مزاج و آہنگ اور رجحان ادب کے میدان کو وسیع تر کرنے میں اہم رول ادا کرنے کی ضامن ہے۔ ان کے یہاں ایک صدائے نو، طرز کہنہ کے واقعاتی افسانوں سے ابھر کر علامتی اور تجریدی خد و خال کی ضامن بن جاتی ہے۔ وہ نئے افسانوی فن کے عرفان و آگہی، اور احساس و ادراک سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ان کے مشاہدوں اور تجربوں نے انہیں ایک تناظر عطا کر دیا ہے جس کی جھلک ان کے تمام افسانوں میں صاف دکھائی پڑتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ احمد صغیر نے

تحریکات ونظریات اور میلانات تصورات سے زیادہ معاشرے کی اصل شکل وصورت پر توجہ دینے کی زیادہ کوشش کی ہے نیز کھلی آنکھوں سے زندگی کے نشیب وفراز کو سمجھنے کی مکمل سعی کی ہے۔غرض انہوں نے اپنی کہانیوں میں حیات وزیست کی تلخیاں اور حقائق کی کڑواہٹ اور تلملاہت کو سپر ہیٹ کی تہہ چڑھانے کی کدوکاوش کر کے حلق کے نیچے اتارنے پر راضی کرلیا ہے۔

ڈاکٹر کوثر مظہری

80 کے بعد جن افسانہ نگاروں کی شناخت بنی ان میں احمد صغیر کا نام اہمیت کا حامل ہے۔وہ ایک حقیقت پسند افسانہ نگار ہیں لیکن فنکاری یہ ہے کہ حقائق کی پیشکش میں وہ وقائع نگار نہیں بن جاتے بلکہ ان کی فکشن کی آنکھ حقائق کو دیکھتی' آنکتی ہے اور تب ان کی پیشکش کرتی ہے۔وہ علامتی حقیقت نگاری کے بجائے سادہ حقیقت نگاری سے کام لیتے ہیں۔ان کی کہانی ''سوانگ'' پڑھتے ہوئے اندازہ ہوگا کہ ہمارے معاشرے میں کیسے کیسے کردار موجود ہیں۔ایک شخص کس مجبوری کے تحت روزی روٹی کے لئے کردار بدلتا رہتا ہے۔احمد صغیر کی کہانیوں میں طبقاتی کشمکش کو پیش کرنے والی کہانیاں بھی ہیں۔''فصیل شب میں جاگتا ہے کوئی'' کا کردار کارو مانجھی احتجاج کی علامت بن کرابھرا ہے۔کہانی کار نے تخلیقی شعور سے کام لے کر طبقاتی کشمکش اور احتجاج کے عوامل کو پیش کیا ہے۔اس میں ''کامریڈ V'' کی پیش کش عورت میں پیدا ہونے والے احتجاجی روّیے کو ظاہر کرتی ہے۔نکسلی موومنٹ کے نقوش اس چھوٹی سی کہانی میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ایک کہانی اس مجموعے میں ''پناہ گاہ'' ہے جس کا موضوع عام سا ہے۔ایک غریب بے سہارا عورت جس کا شوہر مرچکا ہے' اس کی بیٹی جوان ہونے لگتی ہے' تو فطری طور پر عورت پریشان ہوتی ہے۔زمانے کی بری نظروں سے بچانے کے لئے وہ اپنی بیٹی سمتا کو ماسٹر رام پریکھا سنگھ کی امان میں رکھ چھوڑتی ہے۔وہ اسے پڑھاتا ہے لیکن دھیرے دھیرے وہ اس کی عصمت کو بھی داغدار کر دیتا ہے۔یہ بھی ہمارے معاشرے کا ایک المناک پہلو ہے۔

احمد صغیر کی خوبی یہ ہے کہ وہ تخیلات کی بنیاد پر کہانیاں نہیں لکھتے۔انہیں معلوم ہے کہ کہانیاں اسی معاشرے میں ہمارے آس پاس بکھری ہوتی ہیں۔وہ بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ معاشرے کی کریہہ صورت کو خوبصورت لفظوں کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔ان خوبصورت مجموعے پر انہیں میں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

معصوم عزیز کاظمی

احمد صغیر کے افسانوں کا بنیادی وصف ظلم، جبر اور ناانصافی کے خلاف صدائے احتجاج ہے۔وہ اپنی تخلیقات میں عصری آگہی اور حسّیت کا احساس دلاتے ہیں۔عصری حالات کا وہ نہ صرف مطالعہ اور مشاہدہ کرتے ہیں بلکہ تجزیہ کر صداقت کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی نے انہیں حق گوئی کا حوصلہ بخشا ہے۔معاشرہ میں دانستہ اور غیر دانستہ رائج استحصال، دہشت، تشدد، فرقہ واریت، خوف، علاقائیت، طبقاتی تصادم، ضعیف العتقادی کے وہ شاکی ہیں۔یہ ان کے افسانوں کے اہم موضوعات ہیں۔زندگی انہیں ہر قدم پہ ایک تجربہ سے آشنا کرتی ہے جو تلخ ہے لیکن سچ ہے۔احمد صغیر کے افسانے اختصار کے حامل ہیں لیکن معنی خیز ہیں۔علامت، استعارہ اور ابہام سے انہیں پرہیز نہیں ہے لیکن یہ انتہا پسند جدیدیت کے قائل نہیں ہیں۔ان کے افسانے ترسیل کی ناکامی کا شکار نہیں ہوتے ہیں۔

زندگی ان کے لئے ایک رزم گاہ ہے۔ تلخ حقیقتوں کو بیان کرنے کے لئے انہوں نے سادہ و شفاف بیانیہ کو فوقیت دی ہے۔ مرصع سازی انہیں عزیز نہیں ہے۔ تمہید و جزئیات نگاری کے بھی وہ قائل نہیں ہیں۔ اپنے افسانوں میں انہوں نے خود (۱) منڈیر پر بیٹھا پرندہ (۲) انّا کو آنے دو (۳) تعفن (۴) درمیان کوئی تو ہے (۵) مسیحائی کا انتخاب بطور شاہکار کیا ہے۔ اس فہرست میں (۱) جنگ جاری ہے (۲) سفر ابھی ختم نہیں ہوا (۳) کرفیو کب ٹوٹے گا کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ افسانہ ''منڈیر پر بیٹھا پرندہ'' ماحول کے زیر اثر ایک ذی حس انسان کے دماغ میں بیٹھا شدہ خوف کا بیانیہ ہے۔ معاشرہ کی بے بسی اور غیر یقینی کیفیت کس طرح انسانی نفسیات کو متاثر کرتے ہیں۔ یہ افسانہ اس کا خوبصورت اظہار ہے۔ افسانے میں پرندہ استعارہ ہے۔ خوف، شک، کرب، عصبیت، دہشت اور بے چینی کا جو حالات کی دین ہیں۔ ان حالات میں تمام سمت کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ انسان کے ذہن و دل میں ہر لمحہ یہ موجود رہتا ہے اور دستک دے کر اسے غیر محفوظ ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ یہ احساس انتشار میں مبتلا کر دیتا ہے اور اس کا کوئی حل نظر نہیں آتا ہے۔ یہ پرندہ کبھی بھی اور کہیں بھی نمودار ہو سکتا ہے۔ اس سے راہ فرار کی سبیل نظر نہیں آتی ہے۔ اس پرندے کے ساتھ جینا شاید اب انسان کا مقدر ہے۔ ایک مختصر اقتباس اس کیفیت کی ترجمانی کرتا ہے۔

''اُف، میں نے پھر اس پرندے کو یاد کر لیا۔ اس نے تو اب میری منڈیر کو خدا حافظ کہہ دیا ہے تبھی تو سارا شہر چھان مارنے پر بھی نظر نہیں آیا۔ اچھا ہوا بھاگ گیا ورنہ اسے جان سے ہاتھ دھونا پڑتا۔ پھر میں ان سارے خیالات کو جھٹک دیتا ہوں۔ کافی بار میں بیٹھ کر ایک کافی پیتا ہوں۔ بُک اسٹال پر کھڑا ہو کر Debonair کا سرسری مطالعہ کرتا ہوں۔ آج کل اچھی تصویریں بھی نہیں چھاپ رہا ہے۔ بہر کیف ایک کاپی خرید کر گھر کی طرف چل پڑتا ہوں۔ دروازہ بیوی کھولتی ہے۔ میں اندر داخل ہوتا ہوں۔ خود بخود میری نگاہ منڈیر کی طرف اٹھ جاتی ہے۔ وہ پرندہ پھر وہاں بیٹھا مجھے گھور رہا تھا۔''

''منڈیر پر بیٹھا پرندہ'' دل سے ٹپکا ہوا لہو ہے جس کی سرخی میں ساری انسانیت نہائی ہوئی ہے۔ اس میں دور جدید کا درد پنہاں ہے۔ بے اعتمادی، بے بصری، بے ضمیری، بے ثباتی جو آج کے معاشرے میں رائج ہے' کی اس افسانہ میں خوبصورت ترجمانی کی گئی ہے۔

افسانہ ''انّا کو آنے دو'' کے متعلق ایک عام خیال ہے کہ اس کا پس منظر نکسل تحریک ہے۔ اس افسانے کی ابتداء سے اختتام تک میں نکسل واد کے عناصر مجھے تلاش کے باوجود نہیں ملتے ہیں۔ یہ افسانہ نکسل واد کا سماج پر مرتب اثرات کو بیان کرتا ہے۔ اور زور و ظلم کے ٹکر پر سنگھرش ہمارا نعرا ہے پر مبنی ہے۔ امارت اور غربت کے تصادم ہونے کی ازلی کہانی دہراتے ہوئے یہ افسانہ غیر موافق حالات میں بھی سنگھرش اور جدوجہد کا اعلان کرتا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار انّا امید، روشنی اور انقلاب کا استعارہ ہے جس کی مفلوک الحال خلق منتظر ہے۔ ایک مختصر اقتباس اس حقیقت کو اجاگر کرتا ہے۔

''کیا اکیلا ہی انّا اس نظام کو بدل دے گا یا ہر گھر میں ایک انّا کا وجود لازمی ہے؟ ہر گاؤں، ہر قصبے اور ہر گھر میں انّا کی ضرورت ہے جو موجودہ نظام کو بدلنے میں معاون ہو سکے۔ اس قدر انّا آئے گا کہاں سے؟ برسوں میں صرف ایک انّا پیدا ہوتا ہے اور ایک دن میں اسے ختم کر دیا جاتا ہے یا جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا جاتا ہے۔''

یہ افسانہ موجودہ نظام میں صرف انا کی ضرورت اور آمد کی بشارت نہیں دیتا ہے بلکہ خوف زدہ بھی ہے کہ اس نظام میں ایک فردِ واحد کی نہ صرف آواز دبادی جاتی ہے بلکہ یہ فرسودہ نظام اسے ہضم کر جاتا ہے۔ یہ اجتماعیت کی تائید کرتا ہے۔ پھلمتیا کی چلاّہٹ صداقت کا کھلا اعلان ہے۔ احمد صغیر نے اس افسانہ میں انّا کو طاقت اور خوداعتمادی کا مظہر بنا کر پیش کیا ہے جو استحصال کا خاتمہ کر تاریکی کو روشنی میں بدل دے گا۔ انّا کو اس افسانہ میں پسماندہ طبقہ کا نجات دہندہ بنا کر پیش کیا گیا ہے جو خوش آیند مستقبل کے خواب جگاتا ہے۔ حقانی القاسمی نے انّا کے کردار کی اہمیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

''انّا ایک علامت ہے مزاحمت کی، جدوجہد اور بغاوت کی، سماجی، سیاسی نظام بدلنے والے ایک انسان کی۔''

حقانی القاسمی کا تجزیہ حقیقت پر مبنی ہے لیکن یہ حقیقتیں اب کچھ پامال ہو رہی ہیں۔

افسانہ ''تعفن'' میں ایک نفسیاتی نکتہ بہت لطیف انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ غربت کے پروردہ انسان میں حس لطیف مٹ جاتی ہے اور اس کے سارے اعصاب متاثر ہو جاتے ہیں۔ اچانک تبدیلی سے وہ اپنے آپ کو ہم آہنگ نہیں کر پاتا ہے اور ناگفتہ بہ حالت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار منوا ایک ایسا بچہ ہے جو کچرے اور کوڑے کرکٹ سے استعمال شدہ چیزیں چن کر کباڑیوں کو فروخت کرتا ہے۔ اس طرح اسے جو پیسے ملتے ہیں اسی پہ زندگی کا انحصار ہے۔ مسلسل گندگی اور بدبو میں زندگی کے لمحات گزارنے کی وجہ سے اس کے اعصاب ایک خاص نہج اختیار کر لیتے ہیں۔ زندگی کے کسی اور مترادف رویئے سے روبہ رونہ ہونے کی وجہ سے وہ جذبہ ہمدردی، خوش ذائقہ غذا اور خوشبو کے لطیف احساس سے ناآشنا رہتا ہے۔ ایک دن زندگی کی روزمرہ کی قواعد کے برخلاف جب مسز ملکانی اس پر ترس کھا کر ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے لذیذ کھانا اپنے ہاتھ سے اسے کھلاتی ہیں تو وہ نفسیاتی کشمکش کا شکار ہو کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ اس مقام پہ قاری اس حقیقت سے اتفاق کرتا ہے کہ ناشناسائی سے شناسائی کا سفر اذیت ناک اور ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ منوا کا کردار اس صداقت کو اجاگر کرتا ہے کہ افلاس میں زندہ، مجبور لوگوں میں زندگی کے لطیف احساس بھی مر جاتے ہیں۔ وہ ایک زندہ لاش ہوتے ہیں جو حس سے عاری ہوتے ہیں۔ احمد صغیر نے منوا کی زندگی کے پس منظر میں پروان چڑھنے والے نفسیات کو پوری مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس افسانہ میں وہ اس بات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ ان کا ضمیر زندہ ہے اور وہ درد پرایا اجاگر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ احمد صغیر نے اہم موضوعات پر افسانے رقم کئے ہیں۔

سید احمد قادری

افسانوی ادب میں احمد صغیر کا نام جانا پہچانا ہے۔ اب تک ان کے دو افسانوی مجموعے ''منڈیر پر بیٹھا پرندہ'' اور انّا کو آنے دو' منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ان دونوں افسانوی مجموعے کے بیشتر افسانے قارئین اور ناقدین کی توجہ مرکوز کرانے میں کامیاب رہے ہیں۔

احمد صغیر کو جو لوگ قریب سے جانتے ہیں وہ اس بات سے واقف ہیں کہ احمد صغیر کا ایک سیاسی تحریک سے تعلق رہا ہے اس تحریک نے احتجاج اور بغاوت کے رجحانات کو نمایاں طور پر ان کے سماجی' نابرابری' سیاسی بحران' خوف و دہشت کے ملے جلے اثرات سفاکانہ اور خونیں واقعات' خود غرضی وغیرہ ہیں جن میں فکری و فنی آگہی کو شدّت سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔

افسانوی مجموعہ ''انا کو آنے دو'' کا پہلا افسانہ اسی عنوان سے ہے جس میں استحصال، احتجاج اور بغاوت کے رجحانات اپنی پوری شدّت کے ساتھ موجود ہیں۔ احمد صغیر نے سیاسی تحریک سے اپنی وابستگی کا اظہار اس افسانے میں بڑے نمایاں لیکن فنکارانہ طور پر کیا ہے۔

''کامریڈ انا کو لال سلام ....لال سلام ....لال سلام........'' (صفحہ 12) لال سلام کے بعد پھلمتیا کی یہ سوچ بھی ایک خاص تحریک کی جانب اشارہ کرتی ہے۔

''پھلمتیا مجمع سے کنارے کھڑی سوچ رہی تھی........'' آج کسی افسر کی ضرور شامت آنے والی ہے........'' (صفحہ 12)

اس تحریک نے یقینی طور پر غریبوں، مزدوروں اور بے بسوں کو سماجی، سیاسی، معاشرتی انصاف کے خواب دیکھائے ہیں ان کے اندر اپنے استحصال کے خلاف بغاوت کا علم اٹھانے کا حوصلہ ہمت اور جرأت بھی پیدا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''انا کو آنے دو'' میں انا ایک علامت کے طور پر ابھرا ہے انا ایک علامت ہے کسی تحریک کا، ظلم وستم اور استحصال کے خلاف آواز بلند کرنے کا۔ اور ہر اس گاؤں میں جہاں سماجی ناانصافی نابرابری کا بول بالا ہے وہاں انا کا انتظار ہے۔ انا جو کہ مسیحا ہے ان افلاک زدہ لوگ کے لئے۔

دوسرا افسانہ ''پیاسی زمیں پیاسا آسماں'' بھی جبر وظلم کی کہانی پیش کرتا ہے۔ گھریلو آیا منکی کے تاخیر سے آنے پر مالکن نشی کا بے رحمانہ برتاؤ اور بھوک سے بلکتے بچے کے لئے دودھ سے انکار پوری شدت سے بے حس اور بے رحم سماج کے رویے کو اجاگر کرتا ہے۔

اس افسانے میں ایک واقعے کو بہت چابکدستی اور فنکارانہ انداز میں احمد صغیر نے پیش کیا ہے اور اسکے وحدت تاثر کو ابھار کر اپنی فنی گرفت اور سماجی شعور کا احساس کرایا ہے۔

''اور ٹائم''، جنسی استحصال کے موضوع پر ایک عمدہ افسانہ ہے موضوع گرچہ کوئی نیا نہیں ہے اس موضوع پر بہت سارے افسانے لکھے گئے ہیں لیکن احمد سغیر نے جس طرح گلبیا اور بھیکو جیسے معصوم اور افلاک زدہ کردار کے ساتھ ساتھ دولت کی چکا چوند میں ڈوبے آسودہ رنجیت سنگھ کے کردار کو ابھارا ہے اور اپنے اظہار و بیان میں جو ندرت پیدا کی ہے اس سے افسانہ کا ایک خاص وحدت تاثر قائم کرنے میں کامیاب ہے۔

احمد صغیر نے اپنے افسانے میں عصری مسائل اور ان سے پیدا ہونے والے حادثات و واقعات کو موضوع بنا کر اپنے کئی اہم کرداروں کے ذریعہ ظلم، تشدد، جبر واستحصال کے خلاف اپنے داخلی اور خارجی کیفیات کا بڑے ہی خوبصورت اور مؤثر انداز میں اظہار کیا ہے۔

اس مجموعے میں کئی افسانے ہیں جو فکری آگہی اور فنی ادراک کی عمدہ مثال بن کر سامنے آئے ہیں۔ ''جنگ جاری ہے'' بھی جبر وظلم اور استحصال کے خلاف جنگ کا اعلانیہ ہے ایک بے حد معصوم نازک سی لیکن ہمت اور جرأت کے شعلوں سے بھری مریم اپنے خطے کو آزاد کرانے کا عزم رکھتی ہے۔ اس امید ویقین کے ساتھ کہ وہ خطہ آزاد ہو جائیگا اور ظلم وزیادتی کی لہلہاتی کھیتی ختم ہو جائے گی اور موسوم فضاء خوشگوار فضا میں تبدیل ہو جائے گی اس کے لئے مریم نے اپنے باپ، بھائی پھر اپنے شوہر کی شہادت پر وہ اپنے عزم اور حوصلہ کو کم نہیں ہونے دیتی ہے اور ہمت اور استقلال کے ساتھ اپنے پیٹ میں پرورش پانے والے بچہ کو بھی جنگ میں ضرورت کو محسوس کر رہی ہے اس لئے کہ جنگ جاری ہے۔ اس وقت تک جب تک جبر ظلم اور استحصال کا خاتمہ نہ ہو جائے۔

احمد صغیر نے اپنے افسانوں میں ترقی پسندی اور جدیدیت کی انتہا پسندی سے گریز کرتے ہوئے ایک جانب جہاں اپنے مخصوص ازم کی تشہیر و تعبیر کو لاشعوری طور پر فکری و فنی ادراک بخشا ہے۔ وہیں انہوں نے اپنے افسانوں کو صرف ذات کے حصار میں قید نہیں رکھا بلکہ ذات کو سماج اور اس کے پیچیدہ مسائل سے جوڑ کر ایک مرقع بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

احمد صغیر اپنے اسلوب، موضوع، مواد، کردار اور ٹریٹمنٹ کے لحاظ سے اپنے افسانوں کا ایسا تانا بانا بنا ہے کہ وہ عصری تقاضوں اور مسائل کے امتزاج کا بہتر نمونہ بن کر ابھرا ہے۔ جن کی اہمیت و افادیت اور معنویت بتدریج واضح ہوتی جاتی ہے۔ یہ تمام عناصر احمد صغیر کو اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں میں منفرد اور بامراد بناتے ہیں۔ یہ بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ احمد صغیر اپنے عہد کی بھرپور نمائندگی کر رہے ہیں اور اپنے افسانوں سے نئے خدوخال کو واضح کر کے روشن مستقبل کا اشاریہ مرتب کر رہے ہیں۔

اشھد کریم اُلفت

احمد صغیر کا نام اس عہد کے افسانہ نگاروں میں خصوصی حیثیت کا حامل ہے۔ ''منڈیر پر بیٹھا پرندہ'' ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے لیکن ''انّا کو آنے دو'' ان کی زبردست احتجاجی رویے کی پہچان ہے۔ اس مجموعے کا ٹائیٹل افسانہ سلگتے مزاج کی ایک نئی لہر ہے اور وہ اپنی زمین سے اتنا جڑا ہوا ہے کہ ویسی مثال نئی نسل کے کسی دوسرے افسانہ نگاروں کے یہاں بہت کم ملتی ہے۔ افسانے کا ٹریٹمنٹ اتنا اچھا ہے کہ کہانی زمین سے اٹھ کر آسمان پر پہنچ جاتی ہے۔ پہلے اس کا آغاز دیکھئے:

''سارا گاؤں دہشت گردوں کا نشانہ بن چکا تھا ـــــــــ

آہستہ آہستہ گھروں سے اٹھتے شعلے اب دھواں بن چکے تھے۔ گلیاں ویران تھیں۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں یوں چھپے بیٹھے تھے جیسے مرغیاں دربوں میں دبکی رہتی ہیں۔ آسمان کا کنارہ تک سیاہ مائل ہو چکا تھا اور ہر طرف خاموشی کی طویل چادر بچھی ہوئی تھی۔ پولس جیپ کی گڑگڑاہٹ، سائرن اور سرچ لائٹ کی روشنی سے چند لمحوں میں سارا گاؤں روشن ہو گیا۔ پولس گواہی اور ثبوت اکٹھا کرنے میں لگ گئی اور ایک بار پھر ادھ جلے گھروں سے رونے اور چیخ پکار کی صدائیں بلند ہونے لگیں ـــــــــ''

افسانے کی پہلی سطر پولسیا مظالم پر ضرب کاری کرتی ہے پھر افسانہ خوف کی پرچھائیوں میں سر اٹھاتا ہے۔ آغاز بے بسی کے اندھیرے سے ہوتا اور انجام تک آتے آتے خوف کی لکیر امید کی کرن بن جاتی ہے۔ یہ کرن بغاوت اور انقلاب کا اشاریہ بن جاتا ہے۔ افسانے کا انجام دیکھئے:

''واپس جاتی جیپ پر بیٹھے دو شخص جلے مکانات کو تمسخر سے دیکھتے ہوئے کہہ رہے تھے ـــــــــ ''بڑے نکسلائٹ بنتے ہیں سالے۔ ایک ہی رات میں ٹھنڈے پڑ گئے۔''

پھلمتیا اچانک سلگ اٹھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور چلا کر بولی ـــــــــ ''انّا کو آنے دو سالو! پتہ چل جائے گا'' ـــــــــ پھلمتیا کی آواز ان ٹھنڈا کرنے والوں تک پہنچی یا نہیں لیکن وقت کے گنبد میں اس کی آواز دیر تک گونجتی رہی ـــــــــ

انّا کو آنے دو ـــــــــ!

انّا کو آنے دو۔۔۔۔۔۔!!‘‘

مزے کی بات ہے کہ ہندوستانی سیاست میں ایسے افسانے کے بعد ایک انّا اپنی ٹوپیوں اور ٹولیوں کے ساتھ آئے بھی لیکن ان کے تاثر زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکے۔ اس لئے کہ ساحل پر سے منجدھار کی گہرائی اور گیرائی کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ عوامی مسائل کے لئے اس کے دکھ درد میں ڈوبنا پڑتا ہے۔ جیسا کہ احمد صغیر کے انّا میں خوبی ہے۔ وہ نکسل واد کا ایسا مجاہد ہے جو ہر محاذ پر پولس کے مظالم کے سامنے سینہ تانے کھڑا ہوا ہے اور اس کے خوف سے ظلم و ستم کی عمارت ڈول رہی ہے۔

’’مسیحائی‘‘ بھی ایک ایسا افسانہ ہے جسے ’’انّا کو آنے دو‘‘ کی اگلی کڑی کہہ سکتے ہیں۔ ’’انّا کو آنے دو‘‘ نکسلائٹوں پر مبنی کہانی ہے۔ انّا جو حکومت کی نظر میں دہشت گرد ہے مگر عوامی نگاہ میں خاص کر اس خطے میں جہاں اس کا زور چلتا ہے مجاہد کی طرح ہے۔ یہ کہانی تو ہندوستانی زمین کی ہے مگر مسیحائی کو انہوں نے عراق کی سرزمین سے اٹھایا ہے۔ یہ کہانی امریکی سولجر ماریہ اور عراقی میاں بیوی نعیم اور طلعت کے اردگرد بنی گئی ہے۔ نعیم امریکی فوجیوں کی نظر میں ایک دہشت گرد ہے اور طلعت اس کی بیوی ہے۔ امریکی سولجر ماریہ بم پھٹنے کے سبب زخمی ہوکر طلعت کے گھر میں پناہ لیتی ہے۔ جہاں طلعت اس کی تیمارداری میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی ہے۔ ماریہ دھیرے دھیرے صحتمند ہونے لگتی ہے اور اچھی خاصی ٹھیک ہو جاتی ہے۔ وہ طلعت کی تیمارداری سے متاثر ہوتی ہے۔ دونوں میاں بیوی چاہتے تو ماریہ کو گھر میں مار سکتے تھے مگر عورت اور زخمی کی وجہ سے وہ اس کے علاج و معالجے کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ امریکی سولجر جب نعیم کی تلاش میں اس کے گھر کو گھیر لیتے ہیں تو ماریہ امریکی فوجیوں سے چلاّ کر کہتی ہے۔ ایسا مت کرو۔ امریکی فوج کچھ نہیں سنتی۔ نعیم کو مار گراتی ہے اور ماریہ کو لے کر چل دیتی ہے۔ ڈاکٹر افصح ظفر اس کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’یہ کہانی ایک ایسا پیغام دیتی ہے جس سے نئی دنیا کی نئی استعماری قوتیں بیسویں صدی کے ایٹم بم اور ناپام بم سے آگے چل کر اب ان دیکھے ہاتھوں سے عام گھروں میں گھستے چلے جا رہے اور استحصال کا یہ طریقہ کتنا گھناؤنا ہوتا جا رہا ہے کہ ان کے اپنے لوگ بھی پناہ مانگنے لگے ہیں۔ ماریہ ایک امریکی سولجر نہیں۔ ایک عام انسان ہے جو چلا چلا کر کہہ رہی ہے تمہارا یہ فعل غلط ہے۔‘‘

احمد صغیر کی اور بھی کئی کہانیاں رواں موضوع کے اعتبار سے اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ ان میں ’’اوور ٹائم‘‘، ’’سفر ابھی ختم نہیں ہوا‘‘ اور ’’کرفیو کب ٹوٹے گا‘‘ کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ ’’درمیاں کوئی تو ہے‘‘ میں بھی کئی افسانے اپنی زمین سے جڑ کر جینے کی جدوجہد کرتے نظر آتے ہیں۔

محمد جسیم الدین

احمد صغیر کی کہانیوں میں زندگی کے حقائق موجود ہیں۔ کہیں یہ زندگی اور رومان کے حسین نظاروں سے عبارت ہے اور کہیں معاشرتی ناانصافیوں اور ظلم و ستم سے زندگی کے سماجی، معاشرتی و رومانی کئی پہلوان کے افسانے میں موجود ہیں۔ ان کے افسانوں میں رومان، حقیقت اور یہاں کے خاص تہذیبی ماحول کی عکاسی ملتی ہے۔ احمد صغیر نے اپنے افسانوں میں حقیقت نگاری اور سماجی شعور کو اپنانے کی کوشش کی ہے اور تخیلات اور غیر فطری زندگی میں الجھنے کی بجائے اسی زمین، مٹی اور معاشرے سے مواد حاصل کیا ہے۔ جس سے قاری کو اپنے معاشرے

کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔انہوں نے اپنے افسانوں میں معاشرتی حقائق اوران کے ساتھ ساتھ یہاں کی تہذیبی زندگی کے نقوش کو ابھارا ہے۔

جدید نسل سے تعلق رکھنے والے افسانہ نگار احمد صغیر نے نہ صرف حقیقت نگاری کو آگے بڑھایا بلکہ اس میں نکھار اور تنوع بھی پیدا کیا۔ دراصل جس زندگی سے افسانہ نگار کی واقفیت درست اور براہ راست ہو اسے اپنے تخیل میں خام مواد کے طور پر استعمال کرنا سونے پر سہاگہ کے مترادف ہوتا ہے۔

سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا اس بدلے ہوئے تناظر کو اردو کے افسانہ نگاروں نے اسی طرح محسوس کیا ہے جس طرح ہم سب بین الاقوامی سیاست کے زیر اثر جی رہے ہیں اور جن پیچیدہ معاملات سے دوچار ہیں۔ جہاں کوئی باضابطہ اصول' مطمح نظر یا فلسفہ کام نہیں آرہا ہے اب ایک مرکز پر ٹھہراؤ نہیں۔فکری اور جماعتی دونوں ہی اعتبار سے انتشار پسندی میں اضافہ ہوا ہے۔مثال کے طور پر تعلیم کو ہی لے لیجئے آج تعلیم کا مقصد شخصیت کی تعمیر اور صحتمند تہذیبی قدروں اور علمی استعداد میں اضافہ کے لئے نہیں ہے بلکہ ذاتی ترقی اور نفع ہے۔احمد صغیر کے افسانوں میں اس قسم کے مسائل کو اٹھایا گیا ہے۔''داغ داغ زندگی'' سولہ افسانوں کا مجموعہ ہے جس میں انہوں نے موجودہ معاشرے کا آئینہ دکھایا ہے۔''میں دامنی نہیں ہوں'' کا یہ اقتباس ملاحظہ کریں:

''سکھیا اپنی بیٹی کی لاش لے کر ایک میڈیا والے پاس گئی۔آپ تو میڈیا والے ہیں۔میری بیٹی کی عزت لوٹی گئی اور ظالموں نے اسے جان سے بھی مار ڈالا۔آپ اپنے چینل پر اس رپورٹ کو دکھایئے تا کہ میرے ساتھ انصاف ہو سکے۔ظالموں کو سزا مل سکے۔''

میڈیا والا زیرلب مسکرایا

تیری بیٹی کوئی دامنی تھوڑی ہی تھی یا اسکول میں پڑھنے والی وہ کمسن لڑکی بھی نہیں تھی۔جس کی عزت لوٹی گئی ہے۔تیری عزت کی قیمت ہی کیا ہے جو خبر بناؤں۔تمہاری رپورٹ سے ہمارے چینل کا ٹی۔آر۔پی بھی نہیں بڑھے گا۔جاؤ اس لاش کو جلانے کا انتظام کرو۔میری طرف سے یہ سو روپے رکھ لو لاش کو جلانے میں کام آئے گا۔''

سکھیا نے وہ روپے تو نہیں لیا البتہ اپنی بیٹی کی لاش لئے ایک لیڈر کے پاس پہنچ گئی۔

حضور میری بیٹی کی عزت اور جان........

لیڈر کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے سکھیا کی طرف دیکھا ــــــــ

''اگر تمہارے جیسی عورتوں کو پالٹیکل ایشو بنایا گیا تو کتنی جنتا میرے ساتھ اترے گی۔دامنی میڈیکل کی چھاترا تھی اس لئے لوگوں کی ہمدردی اس کے ساتھ تھی۔پورے ہندوستان میں تحریک نے زور پکڑا اور سرکار کو قانون تک بنانا پڑ گیا........ نہیں........نہیں........تمہارے ایشو پر ہم کوئی تحریک نہیں چلا سکتے........جاؤ اور اس کا انتم سنسکار کرو۔لو میری طرف سے پانچ سو روپے رکھ لو۔بھگوان تمہاری بیٹی کی آتما کو شانتی دے۔''

یقیناً اس اقتباس میں بدلتے دور کا اور ترقی یافتہ سماج کا ایک المیہ ہے جو ہمیں پل بھر سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ ہماری فکر اور سمجھ کی سطح کہاں جا رہی ہے۔ ''داغ داغ زندگی'' بھی ایسا افسانہ ہے جو ماحول اور معاشرے میں انسان کس طرح ڈھل جاتا ہے اور آخر کار نا عاقبت اندیشی سے ایسی حرکت کر بیٹھتا ہے جس سے کہ پوری زندگی داغ دار ہو جاتی ہے اور اس کا کرب زندگی بھر برقرار رہتا ہے۔ ''شدھی کرن'' میں اونچ نیچ کے فلسفے کو نئے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ''مسیحائی'' میں ازلی و ابدی دشمنی کی زہرناکی کو بیان کیا ہے۔ الغرض مجموعی طور پر ''داغ داغ زندگی'' میں شامل سبھی افسانے قارئین کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں اور انسان کے دل و دماغ پر اپنا تاثر چھوڑتے ہیں۔ امید ہے کہ احمد صغیر کا یہ افسانوی مجموعہ بھی ان کے سابقہ افسانوں کی طرح قبولیت حاصل کرے گا۔

ڈاکٹر غضنفر اقبال

احمد صغیر کا فسانہ ''انّا کو آنے دو'' نکسلائٹ موومنٹ کی داستان ہے۔ اس میں 'انّا' کا کردار علامت کے طور پر ابھرا ہے۔ 'انّا' گویا اس افسانے کا استعارہ ہے جس سے ایک نئے انقلاب' ایک نئی صبح' نئی جہت' نئی امید' نئی روشنی کو اجاگر کیا گیا ہے۔

''کیا اکیلا ہی انّا اس نظام کو بدل دے گا یا ہر گھر میں ایک انّا کا وجود اب لازمی ہے؟ ہر گاؤں ہر قصبے اور ہر گھر میں انّا کی ضرورت ہے جو موجودہ نظام کو بدلنے میں معاون ہو سکے اس قدر انّا آئے گا کہاں؟ .... برسوں میں صرف ایک انّا پیدا ہوتا ہے اور بس ایک دن میں اسے ختم کر دیا جاتا ہے یا جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا جاتا ہے۔

تو کیا ہر ماں کو ایک انّا.......

پھلمتیا یہ سب سوچ ہی رہی تھی کہ دھیرے دھیرے واپس جاتی جیپ پر بیٹھے دو شخص جلے مکانات کو تمسخر سے دیکھتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

''بڑے نکسلائٹ بنتے ہیں سالے' ایک ہی رات میں ٹھنڈے پڑ گئے!''

پھلمتیا اچانک سلگ اٹھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور چلا کر بولی.......

''انّا کو آنے دو سالو! پتہ چل جائے گا!'' پھلمتیا کی آواز ان ٹھنڈا کرنے والوں تک پہنچی یا نہیں لیکن وقت کے گنبد میں اس کی آواز دیر تک گونجتی رہی۔

''انّا کو آنے دو.......

انّا کو آنے دو.......''

(احمد صغیر۔ انّا کو آنے دو۔ ص۔ 13)

احمد صغیر نے اس افسانے میں انّا کے کردار کو زندہ بنا دیا ہے۔ پوری دنیا میں خوف و ہراس' دہشت کا موحول' عام ہوتا جا رہا ہے۔ خون کی ہولی سرعام کھیلی جا رہی ہے۔ جانوں کی کوئی قیمت نہیں رہی۔ ہر طرف خون پانی کی طرح بہہ رہا ہے۔ ایسی صورت حال کے پس منظر میں افسانہ نگار نے ''انّا'' کے ذریعہ خوشگوار مستقبل کا اشارہ مہیا کیا ہے۔ 'انّا' کے کردار کو حقانی القاسمی اس طرح بیان کرتے ہیں۔

''اناّ'' ایک علامت ہے مزاحمت اور مقاومت کی، جدوجہد اور بغاوت کی، سماجی، سیاسی نظام کو بدلنے والے ایک انقلابی انسان کی''۔

(حقانی القاسمی۔افسانے کے بیچ۔طواف دشت جنوں۔ص۔34)

''اور ٹائم'' میں احمد صغیر نے افسانے کی ہیروئین کا مجبوری میں جنسی استحصال کو پیش کیا ہے۔ایک گاؤں کا جوڑا شہر میں آکر سیٹھ کے یہاں نوکر ہو جاتا ہے۔ایک دن موقع پا کر سیٹھ رنجیت سنگھ گاؤں سے آئے ہوئے ہیرو کی بیوی کی عصمت دری کرنا چاہتا ہے مگر وہ بچ نکلتی ہے۔افسانہ کا منظر نامہ یوں تبدیل ہوتا ہے کہ ہیرو کے ساتھ حادثہ پیش آتا ہے وہ ہسپتال سے گھر آکر زیر علاج ہوتا ہے۔اس حادثہ کا فائدہ اٹھا کر سیٹھ رنجیت سنگھ ہیرو کی بیوی کا جنسی استحصال کرتا ہے۔یہاں تک کہ ہیرو کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی خاطر اس کی بیوی اور ٹائم کر رہی ہے۔اس افسانے سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''رنجیت سنگھ کے یہاں گلبیا کی حاضری بنتی رہتی ہے۔اکثر آدھی رات کو بھی بھیکو کے قریب سے اُٹھ کر اسے رنجیت سنگھ کے پاس جانا پڑتا ہے۔پہلے تو بھیکو نہ سمجھ سکا لیکن آہستہ آہستہ اسے بھی احساس ہو جاتا ہے کہ اس کی دوروٹی اور اس کا علاج گلبیا کے اور ٹائم کی بدولت ہے۔

گلبیا اندر ہی اندر گھٹ رہی تھی۔وہ ایک ایسے پرندہ کی مانند خود کو محسوس کرتی ہے جو صدیوں سے کسی پنجرہ میں مقید ہو اور جس کی رہائی کی کوئی امید نہ ہو،وہ اکثر سوچتی ـــــ اب جو اس کا بیٹا ہوگا وہ بھی بھیکو کی طرح رنجیت سنگھ کی ہی غلامی کریگا۔وہ کبھی پڑھ لکھ نہیں سکے گا، کبھی دفتر کا بابو نہیں بن سکے گا۔اس کی اپنی کوئی زندگی نہیں ہوگی بلکہ رنجیت سنگھ یا رنجیت سنگھ کے بیٹے کی بھیک میں دی ہوئی زندگی ہوگی۔اس کی پتنی اگر اور ٹائم نہیں کرے گی تو اسے بھی بھیکو کی طرح ایک دن اپاہج بنا دیا جائیگا اور تب اس کی پتنی رنجیت سنگھ کی حویلی میں اور ٹائم کرنے پر مجبور ہو جائیگی۔

(احمد صغیر، افسانہ اور ٹائم۔(اناّ کو آنے دو، دہلی)ص 28-27)

●●

اُردو فکشن میں ادھر بیس پچیس سال سے ایک نام ابھر کر سامنے آیا ہے جس میں جدیدیت کے غلغلے سے ہٹ کر اُردو کہانی میں ایک ایسی فضا تیار کی ہے جس کو ہم نئی ترقی پسندی کے نئے رویے سے جوڑ کر دیکھ سکتے ہیں۔کہانی کا ہر فنکار بنیادی طریقے پر یہ سوچ کر کام کرتا ہے کہ وہ اپنی کہانی میں جدید سے جدید تر بھی ہے اور ترقی پسند سے بھی زیادہ ترقی پسند یعنی اپنی دہی کو کون کھٹا کہتا ہے۔لیکن نئی دنیا میں شعر و ادب میں بھی اور انسانی زندگی کے دوسرے شعبے میں بھی سکہ رائج الوقت کے طور پر فکشن کے افہام و تفہیم ہوتے رہتے ہیں۔اس لئے جب احمد صغیر نے فکشن کی دنیا میں غالباً 1980 کے بعد جو رویہ اپنایا تو وہ ہماری سماجی اور سیاسی زندگی میں ایک نکسل وادی انداز پیدا ہو گیا تھا۔اور احمد صغیر کو بھی لوگوں نے اس دائرے میں ڈالنے کی کوشش اس طرح شروع کی کہ ان کا کردار جوان کی کہانی اناّ کو آنے دو میں ابھرا تھا۔اسے اس طرح جوڑا گیا کہ اس نے کہانی کا کردار اناّ کو روبینسن کروسو بنا دیا یا احمد صغیر کو نکسل واد کے اسلحی تصور سے منسلک کر دیا۔میں

نے جب اس کہانی کو پڑھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اناّ کا کردار نہ تو روبینسن کروسو ہے جو امیروں کو لوٹ کر غریبوں کے گھر سجا تا ہے اور نہ اناّ کوئی ایسی ذات ہے جو اپنے سماج کو چشم زدن میں بدل دے۔ صرف یہ کہنے سے ''اناّ کو آنے دو سالو پتہ چل جائے گا۔'' اس کہانی کی پھلمتیا کی یہ آواز محض بھرم ہے ورنہ اس کہانی کے کردار کچھ اور سوچتے ہیں۔

پروفیسر افصح ظفر

احمد صغیر کی یہ کہانیاں حقیقت سے زیادہ قریب ہیں حالانکہ جا بجا رومانی و تخلیقی جملوں اور عنوانوں نے اسے بڑی حد تک افسانوی فضا بنائی ہے تاہم ان کی ترقی پسندی، سماجی وابستگی نے بڑے خلوص و اہتمام سے اسے جذب و پیوست کیا ہے۔ اس لئے کوئی چاہے تو اسے اکہری یا جامد حقیقت کہہ سکتا ہے جبکہ حقیقتیں سیال بھی ہوا کرتی ہیں اور پیچیدہ بھی۔ کہیں ماسٹر بدکردار ہو جاتا ہے اور کہیں بد دماغ مالکن پر ممتا غالب آجاتی ہے اور کہیں ظالم اور سخت پولس والا اچانک نرم اور رحم دل ہو جاتا ہے۔ کرداروں کے ان متضاد رویوں سے انسان کی بوالعجمی تو ظاہر ہوتی ہے۔ کہانی کا تاثر بھی دلچسپ اور معنی خیز ہو کر زندگی سے جڑ جاتا ہے۔ اس عمل کو پیش کرنے میں صغیر خاصے کامیاب ہیں۔ دلت اور غریب طبقہ سے وابستہ یہ کہانیاں فن اور تہذیب کے اعتبار سے جس معیار کی بھی سمجھی جائیں لیکن فنکار کی صداقت اور زندگی کی حقیقت سے الگ کر کے دیکھ پانا مشکل ضرور ہے۔ ان کہانیوں میں انسانیت بالائی سطح پر تیرتی نظر آتی ہے اور انسانیت سے بڑی کوئی شے نہیں، اس کا اپنا جمال ہوتا ہے اور جلال بھی۔ دلت پر لکھنا یوں بھی آسان نہیں۔ ایک اردو افسانہ نگار کے لیے ایک مسلمان کے لیے بطور خاص اس لیے خالص دلتوں اور غریبوں کے خشک و غیر دلچسپ مسائل پر افسانے لکھ کر احمد صغیر نے جرأت و جسارت کا کام تو کیا ہی ہے یہ افسانے احتجاجی تو ہیں ہی انحرافی بھی ہیں۔ بہت پہلے پریم چند نے بھی انحراف کیا تھا تو ان کے خلاف احتجاج ہوا تھا۔ آج صورتِ حال بدل ضرور گئی ہے لیکن ہم اندر سے آج بھی فیوڈلزم سے زیادہ الگ نہیں ہیں اس لیے ان کہانیوں کی قبولیت میں رخنے آسکتے ہیں لیکن ان کی انحرافی وا حتجاجی کیفیت سے انکار نہیں کر سکتے کہ یہی کیفیت اور خاصیت ہی ان کہانیوں کو پڑھوائے گی اور اس کی انسانیت ہی اسے زندہ رکھے گی۔ اس جسارت کے لیے احمد صغیر یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں۔

پروفیسر علی احمد فاطمی

تعارف

نام	:	محمد صغیر
قلمی نام	:	**احمد صغیر**
والدین	:	محمد حنیف (مرحوم)، ساجدہ خاتون
پیدائش	:	۲۱ نومبر ۱۹۶۳ء
مولد	:	محلّہ گیوال بیگہہ، گیا (بہار)
تعلیم	:	پی ایچ۔ڈی (اُردو)
ملازمت	:	انوگرہ میموریل کالج، گیا
اہلیہ	:	نزہت پروین
اولادیں	:	التمش صغیر فرجاد صغیر

دیگر کتابیں:

- نئی کہانی نیا مزاج (انتخاب اور تجزیہ) 1989
- چھ دسمبر (بابری مسجد پر لکھی گئی نظموں کا انتخاب) 1993
- منڈیر پر بیٹھا پرندہ (افسانوی مجموعہ) 1995
- انا کو آنے دو (افسانوی مجموعہ) 2001
- جنگ جاری ہے (ناول) 2002
- چنگاریوں کے درمیان (غزلیں — ہندی) 2002
- اردو افسانے میں احتجاج (تحقیقی مقالہ) 2003
- درمیاں کوئی تو ہے (افسانوی مجموعہ) 2007
- دروازہ ابھی بند ہے (ناول) 2008
- اردو افسانے کا تنقیدی جائزہ (۱۹۸۰ء کے بعد) 2009
- ایک بوند اُجالا (ناول) 2013
- داغ داغ زندگی (افسانوی مجموعہ) 2013
- بہار میں اُردو فکشن (تنقید) 2014

تراجم:

- بے شناخت (اردو سے ہندی) ناصر بغدادی
- تلاش بہاراں* (اردو سے ہندی) کشوری لال نسیم
- پرتی نیدھی شاعری* (اردو سے ہندی) اکبر الٰہ آبادی
- پرتی نیدھی شاعری* (اردو سے ہندی) شکیب جلالی
- پرتی نیدھی شاعری* (اردو سے ہندی) خواجہ میر درد

[*یہ چاروں کتابیں رادھا کرشن پرکاش، نئی دہلی سے شائع ہو چکی ہیں]

اعزاز و انعام:

- منڈیر پر بیٹھا پرندہ (بہار اردو اکادمی) ۱۹۹۵
- انا کو آنے دو (مغربی بنگال اردو اکادمی) ۲۰۰۱
- جدید اردو افسانوں میں ۔۔ (دہلی اردو اکادمی) ۲۰۰۳
- درمیاں کوئی تو ہے (سہیل عظیم آبادی ایوارڈ' بہار اُردو اکادمی) ۲۰۰۷
- جدید اردو افسانوں میں ۔۔ (بہار اردو اکادمی) ۲۰۰۳
- اُردو افسانے کا تنقیدی جائزہ (اتر پردیش اردو اکادمی) ۲۰۰۹

●●